

فہرست

5	صائمہ اسما	ابتدا تیرے نام سے	اداریہ
7	فاطمہ طیبہ	وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ	انوارِ ربانی
9		حمدیہ ولعتیہ کلام (بیتِ محبتی مینا)	
11	اُم راشد	ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے	قیامت کو ملیں گے!
17	ثریا اسما	وہ زخمِ محبت کا ری ہے	
19	شاہدہ اکرام	کہہ دو مرے مرقد پہ اب	
25	زہرا نہالہ	وہ جو میرے دل کے قریب تھیں	آہ! یہ زخمِ جدائی
29	عارفہ ہمایوں	جس کے دم سے تھی رونقِ محفل	
31	ذروہ احسن	لَوْ لَوْ الْمَلِكُونَ	
34	حمیرا خالد	میرا پیغامِ محبت ہے	
36	فراغتِ غنفر	نیند سی نیند ہمیں اب نہ اٹھانا لوگو!	
38	سامیہ احسن	محبتوں کے سفیر	
39		غزلیں قطعات اور نظمیں	قلقلِ مینا
45	ڈاکٹر بشریٰ تنیم	چراغ سے چراغ جلتے رہیں	اُن کا سایہ نہ رہا.....
51	صائمہ اسما	زندگی بیت گئی آبلہ پائی نہ گئی	
55	قائدہ رابعہ	اب ترا جدا ہونا	
59	آسیہ راشد	ملکہِ حسنِ بیاں	
63	ڈاکٹر سمعیہ راحیل قاضی	مینارہ نور	
65	صالحہ محبوب	روشنی کے مینار	یادیں ان کی
67	شاہدہ خاتون	مینا آپا، کچھ یادیں کچھ باتیں	
69	احمد محبتی، مریم ہمایوں	پیارے نانو	
73		رفعتِ اشتیاق، ام احمد، مریم شہزاد، ہما جبین، ارم آصف	محشر خیال
77	فرزانہ چیمہ	چلتے چلتے	ہلکا پھلکا
80	عنزہ عثمان		کچن کارنر

ابتدا تیرے نام سے

محترم قارئین! مون سون نے گرمی کی شدت زائل کر دی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ بارانِ رحمت نے شہروں کے اندر جگہ جگہ لوگوں کی زندگی مشکل بنادی۔ کئی کچے مکان مکینوں پر آگرے اور نشیبی علاقے پانی سے بھر گئے۔ ہمارا یہ حال ہے کہ ایک ہی بارش ہمارے شہری نظام کی قلعی کھولنے کے لئے کافی ہے۔ اللہ کرے اس بار بارشوں کا موسم آزمائش بنے بغیر خیر و عافیت سے گزر جائے۔ ہماری آدھی آبادی ابھی تک گزشتہ برس کے سیلابوں کے اثرات سے نبرد آزما ہے۔

بھارت کی قومی تحقیقاتی کمیٹی نے کرنل پروہت کو بری کر دیا ہے۔ یہ شخص سمجھوتہ ایکسپریس پر بزدلانہ حملے کا ذمہ دار تھا جس میں 68 بے گناہ لوگ مارے گئے اور جن میں اکثریت پاکستانیوں کی تھی۔ کرنل پروہت بھارتی فوج کا حاضر سروس افسر تھا، انٹی ٹیرر سکواڈ کے سربراہ ہیمنت کرکرے نے اس کو گرفتار کر لیا مگر جلد ہی خود کرکرے کو جان سے ہاتھ دھونے پڑے۔ دہشت گردی کی اس کارروائی میں پروہت کے ساتھ اس کے اور فوجی ساتھی بھی شامل تھے۔ اب جبکہ کئی سال مقدمے کو طول دینے کے بعد آخر کار اسے الزامات سے بری کر دیا گیا ہے تو پاکستانی حکومت یا سفارتخانے کی جانب سے کوئی احتجاج سامنے نہیں آیا۔ بھارتی سرزمین پر کچھ ہو جائے، ان کی حکومت اور میڈیا لمحہ ضائع کیے بغیر پاکستان کے خلاف بھرپور الزام تراشی شروع کر دیتے ہیں۔ بعد میں ذمہ دار خود ان کے اپنے لوگ نکلتے ہیں، اور ہم اپنے لوگوں کی ہلاکت کے واضح مجرم کو بھی یوں باعزت بری کرنے پر کچھ نہ کر سکے۔

مختلف رپورٹوں کے مطابق بھارت میں انسانی حقوق کی صورتحال بے حد تشویشناک ہے۔ بھارت دہشت گردی، عدم برداشت اور نفرت کے رویوں کو جنم دینے اور پروان چڑھانے والی سرزمین ہے۔ یہی رویے آخر کار پاکستان کے وجود میں آنے کا باعث بنے اور تب سے لے کر آج تک پاکستان سے دوستانہ تعلقات استوار کرنے کی راہ میں رکاوٹ ہیں۔ آج کی مہذب دنیا میں یہ تصور ہی شرمناک ہے کہ قومی فوج کے اعلیٰ افسران دہشت گردی کے ایسے منصوبے تشکیل دے کر ان پر عمل پیرا ہوں، جن کے نتیجے میں ہمسایہ ممالک سے خیر سگالی کے لئے آنے والے بے گناہ شہری مارے جائیں اور اس سے بڑھ کر یہ کہ بیوقوفوں کے باوجود ان کو بری کر دیا جائے۔ کیا ہر وقت بھارت کی تعریف میں رطب اللسان مغربی میڈیا کو بھارت کا یہ مکروہ چہرہ نظر نہیں آتا؟ اور بھارتی جمہوریت اور سیکولرزم کے مدح خواں اس پر کیا تبصرہ کریں گے؟ پاکستان اور خود بھارت کے اندر سنجیدہ حلقوں کی جانب سے ہمیشہ بھارتی حکومت کو یہ مشورہ دیا گیا ہے کہ وہ اپنی سرزمین پر ہونے والی دہشت گردانہ کارروائیوں کی جڑیں خود اپنے معاشرے میں تلاش کرے جہاں بیسیوں علیحدگی پسند تحریکیں چل رہی ہیں، محروم طبقات کی بھرمار ہے، کثیر آبادی چھوٹ چھات ذات پات کی ڈسی ہوئی ہے اور ہندو تو جیسا نفرت انگیز نظریہ رکھنے والی ڈھیروں انتہائی منظم اور مسلح تنظیمیں سرگرم ہیں، جن کے دہشت گردانہ عزائم سے کوئی اقلیت اپنے آپ کو محفوظ محسوس نہیں کرتی۔ دوسری طرف خود بھارتی حکومت کی

پاکستان سمیت دنیا بھر میں خصوصاً اسلامی ملکوں میں امریکی سفارتخانے سازشوں، ریشہ دوانیوں اور اینٹی سٹیٹ سرگرمیوں کا گڑھ سمجھے جاتے ہیں۔ دہشت گردی کی امریکی جنگ میں جب سے پاکستان فرنٹ لائن سٹیٹ بنا ہے، پاکستان میں امریکی سفارتخانے کی مشکوک، بلکہ مبینہ طور پر قومی سلامتی کے خلاف سرگرمیاں سامنے آتی رہی ہیں۔ جنرل مشرف کے دور میں ان سرگرمیوں کا انکشاف ہونا شروع ہوا اور موجودہ حکومت آنے کے بعد تو ایسے کام کھل کھلا کر بلا تکلف ہونے لگے۔ امریکی سفارتخانہ ایک طرف پاکستانی سالمیت کے خلاف سرگرمیوں میں ملوث ہے تو دوسری طرف ہماری تہذیبی شکست و ریخت کے لئے پوری طرح مصروف عمل ہے۔ اس کا تازہ ثبوت امریکی سفارتخانے میں منعقد ہونے والی ہم جنس پرستوں کی محفل ہے جس میں ایسے لوگوں کی پاکستان میں ”موجودگی“ کا انکشاف کیا گیا اور اس کی بنا پر ان کے ”حقوق“ ملنے پر زور دیا گیا اور ان کی بھرپور مدد کا یقین دلایا گیا۔

یہ جانتے ہوئے بھی کہ پاکستان آئینی و دستوری لحاظ سے اسلامی ملک ہے جس میں نوے فیصد سے زیادہ شہری مسلمان ہیں اور ہم جنس پرستی اسلام کے نزدیک ایک نہایت فبیح و شنیع فعل ہے جس کی بنا پر قرآن قوم لوط پر عذاب الہی کی تاریخ بیان کرتا ہے، ایسی محفلوں کا انعقاد ہر ذی ہوش پاکستانی کے لئے باعثِ شرم ہے۔ اس تقریب کے خلاف ہماری حکومت سمیت تمام سیاسی جماعتوں مذہبی حلقوں، سول سوسائٹی یہاں تک کہ اقلیتی نمائندوں کی جانب سے بھی شدید مذمت اور احتجاج سامنے آنا چاہیے تھا۔ مگر زیادہ دکھ کی بات یہ ہے کہ سیاسی حلقوں میں سے جماعت اسلامی کے سوا کسی نے بھی اس شرمناک حرکت کا نوٹس نہیں لیا۔ بلکہ ”دی نیشن“ کی رپورٹ کے مطابق مسلم لیگ ن، پی پی پی، اے این پی اور ایم کیو ایم سے رابطہ کر کے جب تبصرہ کرنے کو کہا گیا تو ان سب نے معذرت کر لی بلکہ ایک نمایاں سیاسی شخصیت نے ہم جنس پرستوں کے حقوق بشمول شادی کی پر زور حمایت کی اور مذہبی حلقوں کو برا بھلا کہا۔ نیشن ہی کے مطابق جماعت اسلامی نے دیگر مذہبی حلقوں کے ساتھ مشترکہ بیان میں اس تقریب کی شدید الفاظ میں مذمت کی ہے اور حکومت سے امریکی سفارتخانے کی ان سرگرمیوں کا سنجیدہ نوٹس لینے کا مطالبہ کیا ہے۔ امریکہ جس شرمناک کلچر کو پاکستان میں رواج دینے کی کوشش کر رہا ہے، ہم میں سے ہر ایک کو بطور شہری باوازی بلند اس کو مسترد کرنے اور اس پر احتجاج کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ ہمارے بچوں کے مستقبل کا سوال ہے۔ اگر آج ہم نہیں بولیں گے تو یہ معاشرہ ہمارے بچوں کے لئے محفوظ نہیں رہے گا۔

اس بارشمارہ تاخیر سے شائع ہو رہا ہے جس پر ہم معذرت خواہ ہیں۔ کوشش یہی تھی کہ بنت مجتبیٰ مینا صاحبہ کے بارے میں زیادہ سے زیادہ تحریریں اس میں شامل ہو جائیں مگر لکھنے والوں نے ہمارے اعلان کے باوجود بے حد تاخیر سے تحریریں بھیجیں اور پرچہ وقت پر مرتب نہ ہو سکا۔ بہر حال آپ کی رائے کا انتظار رہے گا۔

دعا گو

صائمہ اسما

وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ

انسانوں سے بڑھ کر محبت نہ کرے۔“ (صحیح بخاری، الایمان باب ۸ حدیث ۱۵)

اللہ تعالیٰ نے سورۃ الم نشرح میں فرمایا:
”اور ہم نے آپ کے لئے آپ کا ذکر بلند کیا“ (آیت ۴)

اللہ تعالیٰ نے اذان کے ذریعے اپنے محبوب نبیؐ کا ذکر اس طرح بلند کیا کہ اللہ کے نام کے ساتھ نبیؐ کا نام ہر اذان میں پکارا جاتا ہے۔ ہزاروں لاکھوں مؤذن ایک وقت میں دنیا کے مختلف گوشوں میں اللہ کے نام کے ساتھ رسول اللہؐ کا نام پکارتے ہیں۔ یہ ایک ایسا معجزہ ہے کہ دن اور رات کا کوئی ایسا لمحہ نہیں جب دنیا کے کسی گوشے میں اذان کی آواز نہ آئے۔ دنیا کے ایک گوشے میں فجر کی اذان کا وقت ہوتا ہے تو کسی دوسرے گوشے میں نمازی نمازِ عشاء ادا کر رہے ہوتے ہیں۔

اگر ہم دنیا کے مشرقی کنارے سے سفر شروع کریں تو سب سے پہلے انڈونیشیا کے مشرقی حصوں میں اذان فجر سنائی دے گی پھر تقریباً ڈیڑھ گھنٹے میں انڈونیشیا کے مغربی جانب جاکر تا میں اذان گونجنے لگے گی۔ یہاں اذانیں ختم ہوں گی تو ملائیشیا میں شروع ہو جائیں گی پھر برما اور اس کے تقریباً ایک

جب رسول خدا محمد ﷺ کے بیٹے قاسم کی پیدائش ہوئی تو عرب کے دستور کے مطابق آپؐ کی کنیت ابوالقاسم پڑ گئی لیکن قاسم نے بہت ہی مختصر دو سال کی زندگی پائی۔ اس کے بعد یکے بعد دیگرے آپ کے ہاں دو اور بیٹوں کی پیدائش ہوئی مگر جلد ہی وہ بھی دنیا سے رخصت ہو گئے تو کفار مکہ کو ایذا رسانی کا ایک موقع ہاتھ آ گیا اور انہوں نے کہنا شروع کر دیا کہ محمدؐ کی نسل ختم ہو جائیگی اور یہ بے نام و نشان ہو جائے گا کیونکہ اس کے ہاں اولاد نہ رہے گی، نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سورۃ الکوثر میں فرمایا۔

إِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْأَبْتَرُ (۳)

”بے شک آپؐ کا دشمن ہی بے نام و نشان ہے۔“
چنانچہ ایسا ہی ہوا آج آپ کے دشمنوں کا نام کوئی بھی عزت سے نہیں لینا ہے جبکہ نبیؐ کا تذکرہ ہر مسلمان کی زبان پر ہے اور آپ کی محبت سے ہی مسلمان کا دل معمور ہے کیونکہ آپؐ کی محبت عین ایمان ہے جیسا کہ رسول اللہؐ نے فرمایا حضرت انسؓ سے روایت ہے:

”مجھے قسم ہے اس اللہ کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے۔ تم میں سے کوئی بھی اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ مجھ سے اپنے ماں، باپ، اولاد اور سارے

رات کا کوئی لمحہ ایسا نہیں ہے کہ کہیں نہ کہیں اذان کے ساتھ
نبیؐ کا ذکر نہ بلند ہو اور مسلمان درود پاک کا تحفہ نہ پیش کریں
- سبحان اللہ

(مندرجہ بالا معلومات انٹرنیٹ کے مضمون The Miracle of Azan سے لی گئیں)



گھنٹے میں بنگلہ دیش میں نماز فجر کا وقت شروع ہو جائے گا۔
پھر مغربی بھارت کے شہروں میں فجر کی اذان سنائی دے گی
کلکتہ اور سری نگر سے گزر کر ممبئی میں اسکے بعد پاکستان کے
شہر سیالکوٹ میں تقریباً اسی وقت اذان فجر شروع ہوگی جب
بھارت کے شہر سری نگر میں ہوگی۔ اس کے 40 منٹ بعد کوئٹہ
اور کراچی میں پھر پاکستان کے تمام شہروں میں فجر کی اذانیں
گو بجے لگیں گی۔ ابھی پاکستان میں فجر کی اذانیں تھمیں گی تو
افغانستان اور مسقط میں موزن اللہ اور رسول اللہ کا نام بلند
کریں گے۔ نماز فجر کے لئے لوگوں کو بلائیں گے۔ بغداد
میں نماز فجر ایک گھنٹے بعد ہوگی۔

تقریباً اسی وقت سعودی عرب کے شہروں مکہ اور مدینہ
میں پھر یمن، UAE، کویت اور عراق میں اذان فجر بلند ہوگی
۔ اس کے ایک گھنٹے کے بعد مصر کے شہر اسکندریہ میں پھر شام
، صومالیہ اور سوڈان میں فجر کی اذانیں سنائی دیں گی۔ جلد ہی
براعظم افریقہ کے بقیہ ممالک میں بھی فجر کی اذانیں شروع
ہو جائیں گی۔ اب اذان فجر بحر اوقیانوس (Atlantic Ocean)
کے مشرقی ساحل تک پہنچ چکی ہے تقریباً ساڑھے
نو گھنٹے بعد۔

اس سے پہلے ہی نماز ظہر کی اذانیں مشرقی انڈونیشیا
میں شروع ہو چکی ہوں گی۔ جب تک ظہر کی اذانیں بنگلہ
دیش کے شہر ڈھاکہ میں شروع ہوں گی انڈونیشیا میں نماز عصر
کا وقت ہو جائے گا۔ جس وقت انڈونیشیا کے موزن فجر کی
اذانیں شروع کرتے ہیں اس وقت افریقہ کے موزن نماز
عشاء کے لئے اذان کی تیاری کرتے ہیں۔ یعنی دن اور

نعتیہ

وہ ہے شاہِ عرب وہ ہے طہِ لقب
وہ ہے جانِ جہاں اس پر قربان سب
سائبانِ محبت پہ لاکھوں سلام
بے وسیلوں کا تنہا وسیلہ بنا
بے سہاروں کا واحد سہارا بنا
ظلمتِ کفر میں وہ نویدِ سحر
شامِ غم میں سحر کا ستارہ بنا
اس نبیؐ کی رسالت پہ لاکھوں سلام
وہ ہے بحرِ سخاوت ہے گنجِ عطا
وہ دعائے خلیلِ وحیبِ خدا
اس کی شانِ سخاوت پہ لاکھوں سلام
وہ شہِ ذی حشم ہے خدا کی قسم
وہ شفیعِ الامم ہے خدا کی قسم
اس نے راہِ ہدایت دکھائی ہمیں
اس چراغِ ہدایت پہ لاکھوں سلام

نعتیہ

اک شمعِ محبت کی جلتی ہے دو عالم میں
اے کاش کوئی دیکھے پروانے محمدؐ کے
کچھ ہوش نہیں رہتا جب وقتِ حضوری
دیوانے سے دیوانے ، دیوانے محمدؐ کے
وعدہ ہے کہ محشر میں پیاسا تو نہ چھوڑیں گے
بھر بھر کے ملے دیکھو پیمانے محمدؐ کے
کیا دیدہ دل اپنے کیا عشقِ بتاں مینا
نہ سب ہوئے نذرانے ، نذرانے محمدؐ کے

حمدیہ

یہ زمیں دیکھوں ، آسماں دیکھوں
تیری قدرت کہاں کہاں دیکھوں
نیلگوں آسماں کے پانی میں
چاند کی کشتی رواں دیکھوں
شبِ شبنمی آئینوں میں تیرا رخ
آنسوؤں میں تجھے نہاں دیکھوں
میری آنکھوں میں یوں بسا ہے تو
تو ہی تو ہے جہاں جہاں دیکھوں
تیری قدرت کے کارخانے میں
تیری قدرت کہاں کہاں دیکھو

حمدیہ

تو عظیم تر ہے گمان سے
تو قریب تر رگِ جان سے
مرا دوست ہے مرا آشنا
مرا راہ بر مرا رہنما
میں کہاں چھپوں مرے راز داں
ترے ہاتھ میں مرے قلب و جاں
تو دکھی دلوں کے قریب ہے
تجھے ڈھونڈتے ہیں کہاں کہاں
تجھے چاہوں تجھ سے ڈروں بھی میں
ترا نام لے کے جیوں بھی میں
رگِ جاں سے تو ہی قریب ہے

ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

نیر بانو، بنت الاسلام، رخشندہ کوکب اور بے شمار خواتین تھیں بعد میں اس کا روان حق میں مینا آ پا بھی شامل ہو گئیں۔ جب وہ لاہور آئیں تو آ پا جان (بیگم مودودی صاحبہ) اور رخشندہ کوکب کے ہمراہ مجھے ملنے آئیں۔ ان کے ساتھ ان کی والدہ بھی تھیں۔ ہماری رہائش ان دنوں ۱۲ شاہ جمال والے گھر میں تھی۔ مارشل لاء کا دور تھا۔ ان دنوں ختم نبوت تحریک چل رہی تھی۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے ”قادیانی مسئلہ“ کتاب لکھی جس کی وجہ سے جماعت اسلامی زیرِ عتاب آ گئی۔ اس تحریک نے حکومتی ایوانوں میں ہلچل مچادی تھی۔ حکومت وقت کی جانب سے دھمکیاں ملنے لگیں۔ تنبیہات جاری ہوئیں۔ زبان بندیوں اور گرفتاریوں کے احکام جاری ہوئے۔ جس کے نتیجے میں جماعت کے بہت سے اراکین کی گرفتاریاں عمل میں آئیں جن میں میرے شوہر عبدالوحید خان صاحب بھی تھے۔ جب یہ خواتین میرے گھر تشریف لائیں تب خان صاحب جیل میں تھے۔ ان کی والدہ نے جب سنا کہ یہاں اس طرح پکڑ دھکڑ کی جا رہی ہے تو وہ بہت آزرده خاطر ہوئیں۔ کیونکہ ان کو ابھی انڈیا سے آئے ہوئے کچھ بھی عرصہ ہوا تھا۔ یہاں کے حالات دیکھ کر بہت دکھی ہوئیں۔ مینا آ پا سے جو پہلی ملاقات ہوئی اس کے بعد تادم

آ پا بنتِ محبتی مینا کی وفات نے فکری طور پر ہمیں ناقابلِ اندمال صدمے سے دوچار کر دیا ہے جس کی تلافی ناممکن ہے۔ وہ بذاتِ خود ایک دبستان کی حیثیت رکھتی تھیں۔ وہ ان لوگوں میں سے تھیں جنہیں دنیا کی بے ثباتی اور اللہ تعالیٰ سے خاص تعلق کا ادراک بہت پہلے سے ہو جاتا ہے۔ اسی ادراک کے تحت وہ اپنی زندگی کا محور و مرکز اپنی ذات سے ہٹا کر بنی نوع انسان کی تعمیر و تربیت کو بنا لیتے ہیں۔

اسی مقصد حیات کے تحت انھوں نے اپنی زندگی کا ایک بہت بڑا فیصلہ کیا۔ اور وہ جماعت اسلامی میں شامل ہونا تھا۔ ان کی زندگی کا مشن ہی جماعت اسلامی کو پروان چڑھانا تھا۔ ان کی زندگی پر اگر نگاہ دوڑائیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ وہ نہ صرف تحریکِ اسلامی کی روح رواں تھیں بلکہ جماعت کی سچی اور خیر خواہ رکن تھیں۔ انھوں نے اپنی تمام عمر بالکل اپنے اس مقصد پر والہانہ نثار کر دی۔

پہلی ملاقاتیں اکثر بھول جایا کرتی ہیں لیکن مینا آ پا سے پہلی ملاقات مجھے آج بھی یاد ہے اس کی وجہ شاید ان کی دلاویز شخصیت کا جادو تھا یا ان کی گفتگو کا اسلوبِ خاص۔

یہ ۱۹۵۳ء کی بات ہے ترقی پسند ادیبوں کے مقابلے میں دین پسند خواتین نے ادبی محاذ کھولا جس میں حمیدہ بیگم،

حیات میرا ان کا ساتھ رہا۔ وہ خدا داد صلاحیتوں کی مالک خاتون تھیں ان جیسی خاتون کا دوبارہ ملنا ناممکن ہے۔

میں حلفاً یہ بات کہہ رہی ہوں کہ جو خوبیاں ان میں موجود تھیں مجھ میں نہیں تھیں۔ میں نے ان سے بہت کچھ سیکھا۔

میں بلا مبالغہ یہ بات کہوں گی کہ میں نے ان کو مولانا مودودی صاحب جیسی صفات کا حامل پایا۔ قدرتی طور پر جو اوصاف مولانا میں پائے جاتے تھے وہی میں ان میں دیکھتی۔ بہت سی باتیں ان میں مشترک تھیں۔

مولانا کو کلام میں ملکہ حاصل تھا جو انھیں بھی تھا۔ مولانا بہت ملنسار تھے وہ بھی ایسی ہی تھیں۔ اخلاقیات میں مولانا بہترین درجے پر تھے۔ کسی نے کبھی بھی مولانا کو بد اخلاقی کا مرتکب نہیں پایا۔ سو یہی صفت ان میں بھی تھی۔ سچائی کی حقیقتوں پر دونوں ہی ایمان لانے والے تھے۔ وہ آگے بڑھ کر پیچھے ہٹنے والوں میں سے نہیں تھے۔

میںنا آپا کے لیے ہر معاملے میں آگے آگے رہنا بہت مشکل کام تھا۔ بہت سے لوگ ایسے ہوتے ہیں جو اپنے کاموں کی اتنی تشہیر کرتے ہیں جیسے وہ آسمان سے تارے توڑ لائے ہوں۔ اپنی تعریفیں کرتے نہیں تھکتے۔ ذرا سا کام کر کے زمین و آسمان کے فلا بے ملانے لگتے ہیں۔ مگر میںنا آپا جیسا بے نیازی کا رویہ شاید ہی کسی کا ہو۔ وہ اپنے آپ کو ہمیشہ پچھلی صفوں میں رکھنے کی کوشش کرتیں۔ اول تو وہ آگے بڑھنے کو تیار نہ ہوتیں مگر جماعت والوں نے آگے کر دیا تو پھر پیچھے ہٹنے والی نہیں تھیں۔

آپا زبیدہ بلوچ وہ اور میں ہم تینوں نے ۲۵، ۳۰ سال اکٹھے کام کیا۔ ہم سب میں بہت ہم آہنگی تھی۔ جماعت اسلامی کے پاس اس دور میں گاڑیاں نہیں ہوتی تھیں مگر ہم نے ان سفری مشکلات کو اپنے مقصد میں کبھی حائل نہ ہونے دیا۔ ہم لوگ بسوں، ٹیکسیوں اور تاگلوں میں بیٹھ کر جماعتی کام کرنے جایا کرتے۔ درس و تدریس، ملاقاتیں اور الیکشن کمپین کے لیے بھی ہم جماعتی گاڑی کے انتظار میں نہ رہتے بلکہ خود سے انتظام کر کے چلے جاتے۔ واپسی پر سب میرے گھر آ جاتے اور ہم سب اکٹھے کھانے کھاتے۔ میں ان سے بہت سے معاملات میں راہنمائی لیتی۔ کئی باتوں میں ہمارا اختلاف ہو جاتا اور میں جذباتی ہو جاتی تو وہ مجھے سمجھاتیں اتنا اچھا راستہ اپنا لیا ہے اس سے بہتر کوئی اور راستہ ہے نہیں آپ خواہ مخواہ جذباتی ہو کر اپنا راستہ کھوٹا کر رہی ہیں۔

وہ مجھ سے عمر میں کافی بڑی تھیں مگر اپنی عادات و اطوار، خوش مزاجی اور ملنساری کی وجہ سے بہت چھوٹی لگتیں۔ وہ ہر عمر کے لوگوں میں گھل مل جاتیں۔ بچوں کے ساتھ بچہ بڑوں کے ساتھ بڑی بن جاتیں۔ ایک ماہ کے بچے سے لے کر سو سال کے بوڑھے تک سبھی کو ایک جیسی توجہ اور محبت دیتیں۔

ایک ماہ کے بچے کو پیار سے گود میں اٹھا کر کہتیں بنانے والے نے کتنے پیار سے ہونٹ بنائے ہیں۔ آنکھیں کتنی پیاری ہیں۔ بچے کے چہرے پر انگلی سے اس کے رخساروں کو چھوتیں اور تعریف کرتی جاتیں اور بچے کی ماں کا دل خوش ہو جاتا۔

اسی طرح میں نے انھیں بوڑھے لوگوں کے کپڑوں کی تعریف کرتے سنا ہمیشہ آج آپ کے دوپٹے کی کڑھائی کتنی پیاری ہے، کتنے خوبصورت رنگ ہیں۔ اس طرح وہ سامنے والے کا دل موہ لیتیں۔ انسانوں سے محبت کرنا ان کا ایمان تھا۔ ان کے کاموں اور اوصاف کا احاطہ کرنے لگیں تو صفحات بھر جائیں۔

جب وہ مولانا مودودیؒ کی تحریک اسلامی سے جڑیں تو ہم بھی ان کے ساتھ جڑ گئے۔ وہ ۷۰، ۷۲ میں رکن جماعت بنیں۔ میں نے ۷۶ء میں رکنیت اختیار کی۔

۱۹۵۷ء میں ان کی شادی عبدالسلام صاحب سے ہو گئی اور وہ ۵۶ نسبت روڈ میں اپنے سسرال کے ساتھ رہنے لگیں۔ یوں انھیں حمیدہ بیگم کے ساتھ کام کرنے کا خوب موقع ملا۔ وہ حمیدہ بیگم کے ساتھ ہمہ وقت رہتیں۔ ادبی محفلوں میں اٹھنے بیٹھنے کے بھرپور مواقع ملتے اور جلد ہی وہ اپنی بہترین شاعری کی وجہ سے جانی پہچانی جانے لگیں۔

ہم دونوں نے الیکشنوں میں دن رات اکٹھے کام کیا۔ ۸۳ء کے الیکشن میں بھی ہم ساتھ ساتھ رہے۔ ان کے شوہر سلام صاحب جماعت اسلامی کے فعال رکن تھے وہ بھی ہمارے ساتھ جماعتی ذمہ داریاں نبھاتے کیونکہ وہ حلقہ خواتین کے ناظم تھے۔ مینا آپا کی وجہ سے ہمیں کام کرنے میں آسانی ہو جاتی۔ اس لحاظ سے وہ بہت مفید ثابت ہوتیں۔ اگر کبھی ہمارا ڈرائیور چھٹی پر چلا جاتا تو مینا آپا کے شوہر سلام صاحب ہماری گاڑی چلاتے یوں ہمارا کام آسان ہو جاتا۔ سلام صاحب ادارہ بتول کا کام بھی ضمناً

کرتے۔

بتول کے میدان میں تین بار توڑ پھوڑ ہوئی اور اختلاف رہا مگر ہم نے اپنے محاذ کو نہیں چھوڑا۔ جب کبھی بھی بتول پر کڑا وقت آیا مینا آپا نے ٹھنڈے دل سے ہمیں اس مشکل وقت کو گزارنے کی نصیحت کی۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو دین کی طرف بلانے کے لیے جو طریقہ کار وضع کیا ہے اس میں سب سے بڑی بات جو بتائی گئی ہے وہ حکمت ہے۔ مینا آپا نے زندگی کے ہر راستے میں حکمت کے اصول کو مد نظر رکھا۔ حکمت ان کی خداداد صلاحیتوں میں سے ایک تھی۔

وہ کہا کرتیں!

پہلے بات کا وزن کیا کرو پھر بولا کرو۔ تم سمجھو بات ہوئی ہی نہیں کیونکہ غصے میں انسان انسان نہیں رہتے بعد میں اس بات کا ٹھنڈے دل اور حکمت سے جائزہ لو۔ ہم نے رشتہ داریاں، برادریاں اللہ کے نام پر چھوڑیں، اب یہی ہمارے خاندان ہیں۔ یہی ہماری محبتیں ہیں۔ اگر ان کو بھی چھوڑ دیں گے تو کہاں جائیں گے۔ اس اجتماعیت کو ہم کبھی ختم نہیں کریں گے۔ کوئی اور کر دے تو یہ اس کا فعل ہے۔

وہ ادیبہ تھیں۔ ادیب دوسروں کو عقلمند بناتا ہے۔ دوسروں کو راہنمائی دیتا ہے۔ اس لیے وہ بہت سوچ سمجھ کر بات منہ سے نکالتیں۔

اگر کوئی غلط کام کرتا اور اس سے دوسروں کو نقصان کا اندیشہ ہوتا تو کہتیں فلاں سے محتاط رہیے گا ورنہ آپ کے کپڑوں پر چھینٹے پڑ جائیں گے۔

وہ خاندانی نظام کی بقا چاہتی تھیں۔ ان کا کہنا تھا ہمارے جو بہن بھائی اپنے نظریات میں اختلاف رکھتے ہیں ان سے بھی آپ محبت کریں کیونکہ انھیں سمجھ نہیں ہے۔

دوسروں کے لیے رعایت چاہتیں کہ رسالہ لکھنا چاہیے۔ اگر دوسروں کو چھوٹ دے دیں تو بہت اچھی بات ہے۔ اپنے آپ کو کہیں دوسروں کے گریبانوں میں جھانکنے کی بجائے اپنے گریبان میں جھانکیں اپنی خامیاں تلاش کریں۔

مینا آپ اور سلام صاحب دونوں ایک ہی رستے کے مسافر تھے۔ ہر وقت کا ساتھ تھا۔ پھر نہ جانے کیسی ہوا چلی سلام صاحب نے اپنا راستہ بدل لیا وہ جماعت اسلامی کو چھوڑ کر ”تحریک اسلامی“ میں شامل ہو گئے۔ مینا آپ کے لیے آزمائش کا وقت تھا۔ میں ان دنوں نائب قیمہ کے طور پر کام کر رہی تھی۔ ہم دونوں گوجرانوالہ میں ایک بڑے جلسے میں شرکت کے لیے جا رہے تھے وہ بہت آزدہ تھیں۔ انھوں نے جاتے ہوئے راستے میں مجھ سے پوچھا، اب مجھے کیا کرنا چاہیے؟

میں نے کہا سلام صاحب بہت اچھے آدمی ہیں۔ شوہر تو وہ آپ کے اسی طرح رہیں گے۔ آپ اپنے گھر میں اسی طرح رہیں جیسے آپ پہلے رہ رہی تھیں۔ پھر انھوں نے بچوں کی طرف سے فکرمندی کا اظہار کیا کہ بچے نہ جانے کس کے ساتھ رہوں؟

میں نے کہا اس میں فکر کی کیا بات ہے۔ باپ کے ساتھ ہوگا تب بھی اسلام میں رہے گا، آپ کے ساتھ ہوگا

تب بھی اسلام میں رہے گا۔ آپ ازبیدہ بلوچ ہمارے ساتھ تھیں انھیں یہ بات بہت پسند آئی۔

مینا آپ کی دلی خواہش تھی کہ بچے ان کے ساتھ جماعت اسلامی میں رہیں۔ جب ان کی بیٹی زہرا نہالہ جماعت کی رکن بنی تو انھوں نے پسندیدگی کا اظہار کیا۔ اپنی بہو زروہ پر بھی بہت خوش تھیں کہ وہ نور کا کام کر رہی ہے۔

جن دنوں چکری میں جماعت اسلامی کا سالانہ اجتماع ہوا انھوں نے کہا میرا بہت دل چاہتا ہے۔ میرے بچے بھی جماعت میں رہیں۔ خود وہ آخر دم تک جماعت کی رکن رہیں۔

ایک مواحدہ اور توکل الی اللہ ہونے کے لحاظ سے دیکھا جائے تو ان کی بنیادیں بہت مضبوط تھیں۔ اس کا اندازہ اس واقعے سے لگایا جاسکتا ہے کہ جن دنوں آپا حمیدہ بیگم حیات تھیں انہی دنوں کی بات ہے سلام صاحب کے کاروبار میں کچھ نرمی آگئی تو مینا آپا نے کہا میں اتنی سیر ہوں کہ میں تصور بھی نہیں کر سکتی کہ میرا رازق خدا مجھے کبھی آزمائے گا۔ میرا پورا ایمان اور یقین ہے کہ رزق اللہ کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ ان کی قبر کو نور سے بھر دے۔ ان میں جو اعلیٰ اوصاف تھے وہ کم لوگوں میں دیکھنے کو ملتے تھے۔

آپ خوبصورتی اور خوب سیرتی کے ساتھ ساتھ مومنانہ صفات کی بھی حامل تھیں۔ انتہائی خوددار، حیا دار، بہترین رازدان، صدقہ کرنے والی، دوسروں کو رعایت دینے والی، ایثار پسند، خوش اخلاق اور سادگی پسند خاتون

تھیں۔

آپ صائب الرائے تھیں اس کے باوجود ہمیشہ دوسروں کی رائے کو فوقیت دیتیں۔ اگر ان کی رائے حق سچ ہوتی تب بھی اپنی رائے دوسروں پر مسلط نہ کرتیں۔

متقی ہوتے ہوئے دوسروں کو تقویٰ سے قریب کرنے کی کوشش میں لگی رہتیں۔ آپ بہترین راہبر و رہنما تھیں۔ ادیب ان کا لکھا ہوا دیکھ کر ادیب بنتے۔ شاعر ان کی شاعری دیکھ کر اپنی اصلاح کرتے۔

جب وہ صدر ادارہ بتول بنیں، مدیرہ بتول و نور رہیں وہ تب بھی ویسی ہی تھیں جیسی کہ عام رکن ہوں۔ غرور و تکبر نام کو نہ تھا۔

ہر کوئی ان کی صحبت سے فیض حاصل کر کے ہی اٹھتا۔ عفو و درگزر ان پر ختم تھا۔ یہ سب مولانا مودودیؒ کا لٹریچر پڑھنے کی وجہ سے ممکن ہوا۔

مجھے ان کی حیا داری کا ایک دلچسپ واقعہ یاد آ رہا ہے۔

۱۹۸۳ء میں وہ میونسپل کارپوریشن کی رکن بنیں۔ وہ اور بیگم زبیدہ واصل دونوں نے کونسلر کا الیکشن جیت لیا۔ میرا بیٹا ناصر ان کا پولنگ ایجنٹ تھا۔ میں ان دنوں ناظمہ شہر تھی اور میری ان کے ساتھ ڈیوٹی تھی۔ الیکشن جیتنے کے بعد ہم تینوں پولنگ اسٹیشن سے باہر نکلے ہمارے ساتھ ۸، ۹ خواتین اور تھیں تو ہمارے استقبال کے لیے باہر مرد حضرات کھڑے تھے۔ انھوں نے ہم سب کو دیکھ کر جیتنے کی مبارکباد کے طور پر تالیاں بجا کر ہمارا استقبال کیا۔ ہم تینوں نے برقعے اوڑھ رکھے تھے۔ ہم نے آگے جانے کے لیے قدم بڑھائے تو کیا

ان کی گھریلو زندگی نہایت سادہ تھی۔ اسی وجہ سے وہ ہمہ وقت بہت سے محاذوں پر کام کر رہی تھیں۔ گھر، بچے، شوہر، سلائی کڑائی، کھانا پکانا، حتیٰ کہ برتن دھونے کا کام بھی شامل تھا۔

اکثر ملازم کی سہولت نہ ہوتی تو وہ بخوبی تمام کام کر لیتیں۔ اس کے علاوہ تحریر کی کام، بتول، ادارہ بتول، حریم ادب، نور کی ایڈیٹنگ سبھی کاموں میں ان کی سلیقہ مندی کی جھلک نظر آتی ہے۔

سلیقہ اور قرینہ ان پر ختم تھا۔ ہم نے سلیقہ شعاری ان سے سیکھی ہے۔ ان کا گھر نفاست طبع اور ذوق سلیم کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ نسبت روڈ پر واقع ان کا سہ منزلہ مکان جو تین کمروں پر مشتمل تھا۔ مجھے ہمیشہ چار کنال کی وسیع و عریض کوٹھی سے بھی بڑا لگا کرتا۔ جو جماعت اسلامی کی روح رواں اور مجلس شوریٰ کی رکن کی رہائش گاہ کہلاتا تھا۔

وہ بہترین سماجی کارکن بھی تھیں۔ جماعتی و غیر جماعتی لوگوں کی دلجوئی اور دلگیری کے لیے عیادت کرنا، ان کی خوشی غمی میں شریک ہونا، ہمہ پہلو جھگڑوں میں تصفیہ کروانے میں انھیں ملکہ حاصل تھا۔ وہ بلاشبہ دوسروں کی پریشانیوں کو بانٹنے والی خاتون تھیں۔ آج کل یہ رویے ناپید ہوتے جا رہے ہیں۔

انتہائی قناعت پسند تھیں۔ اپنے شوہر کی کمائی کو حلال سمجھنا اور اس میں فراوانی تلاش نہ کرنا ان کی بہترین خوبیوں میں سے ایک ہے۔

دیکھا سیڑھیوں میں سٹمش صاحب ہاتھ میں تین تلے والے چکیلیے ہار لیے کھڑے ہیں۔ مینا آپا گھبرا کر بولیں۔ ”یا اللہ خیر! کہاں سے چھپے تھے آگے کہاں پکڑے گئے۔“ میں نے آگے بڑھ کر سٹمش صاحب سے ہار لینے چاہے تو وہ بولے یہ ہار تو میں نے آپ سب کے گلے میں ڈالنے ہیں۔ میں نے کہا خواتین شاید آپ سے ہار نہ ڈلوائیں یہ آپ مجھے دے دیں۔

مینا آپا نے ہار پکڑا لپیٹا اور ابیگ میں ڈال لیا اور کہا ”یہ سب تو ہم نے اللہ کے لیے کیا ہے۔ اللہ سے ڈر لگ رہا ہے، کیا ہی اچھا ہوتا اللہ تعالیٰ ہمیں معاف کر دیتا اور ہم الیکشن ہار جاتے۔ اب اللہ نے ذمہ داری ڈالی ہے تو اس میں خوشی کی کوئی ایسی بات نہیں ہے کہ ہم ہار نہیں۔

بیگم واصل بہت جوشیلی تھیں وہ ہار ہاتھ میں پکڑ کر نکل گئیں۔ مینا آپا نے میرا ہار بھی اپنے بیگ میں ڈال لیا۔

الیکشن کی بات چل نکلی ہے تو میں یہاں بیگم زینب کا کاخیل کا ذکر کیے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتی۔ آپ اسلامیہ کالج کی پرنسپل اور اردو کی پروفیسر تھیں۔ انھوں نے ۸۳ء کے الیکشنوں میں ہمارے ساتھ ڈور ٹو ڈور کام کیا ہے۔ آپ بہت حیا دار، نیک طینت اور اعلیٰ خاندان کی چشم و چراغ تھیں۔ ایک بڑے عہدے پر فائز رہنے کے باوجود انھوں نے بسوں، یا ٹیکسیوں میں سفر کرنے کو اپنے لیے باعث عار نہ سمجھا اور لوگوں کو گھر گھر جا کر سمجھانا اپنا فریضہ اولین جانا۔ اللہ تعالیٰ انھیں غریقِ رحمت کرے۔ ۱۹۸۵ء کو آپ وفات پا گئیں۔ مجھے میدانِ عرفات میں ان کی وفات کی خبر ملی۔

مینا آپا انتہائی مخلص اور سچی خیر خواہ تھیں۔ ان کی حیات کا ایک واقعہ ایسا ہے جس کا ذکر میں اور میرے بچے اکثر کرتے ہیں جس سے ان کی محبت کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔

یہ ۱۹۷۷ء کا واقعہ ہے جب تحریک نظامِ مصطفیٰ زوروں پر تھی۔ ہر طرف پکڑ دھکڑ جاری تھی۔ خوف و ہراس کا عالم تھا۔ جماعت اسلامی کے چار پانچ گھروں پر خفیہ پولیس والے رات کے وقت سرخ سیاہی سے کر اس کا نشان لگا گئے جو اس بات کی علامت تھا کہ ان لوگوں کو حکومتی غیظ و غضب کا نشانہ بننے کے لیے تیار ہو جانا چاہیے۔ ہمارے گھر کے باہر بھی سرخ کر اس بنا ہوا تھا۔

اسی روز اتفاق سے مینا آپا ہمارے گھر آ گئیں، انھوں نے سرخ نشان باہر ہی سے دیکھ لیا تا۔ ان کی چھٹی حس بہت تیز تھی وہ فوراً بھانپ گئیں کہ معاملہ بہت نازک ہے۔ انھوں نے گاڑی سے اترتے ہی ڈرائیور (جن کا نام شاہ صاحب تھا) سے کہا زہرا آپا کے گھر کے باہر جو سرخ نشان ہے اسے مٹا دو۔

وہ برقع پہنے گیٹ کے باہر اس وقت تک کھڑی رہیں جب تک نشان مٹ نہیں گیا۔ نشان مٹ جانے کے بعد وہ گھر کے اندر آئیں اور آ کر مجھے بتایا کہ آپ کے گھر کے باہر سرخ نشان تھا جو میں نے مٹا دیا ہے۔ یہ ان کی ہمارے ساتھ محبت تھی۔ اتنی محبت تو شاید میری ماں بھی مجھ سے نہ کرتی۔ انھیں جماعت کے لوگوں کی ہر دم فکر رہتی کہ انھیں کوئی گزند نہ پہنچنے پائے۔ سارے محلے کے لوگوں کے سامنے

اک ترانام کہ باقی ہے رہے گا باقی
یا وہ اک صاحب دل جو تیری خاطر اٹھے
ہاں! وہ باقی ہے، زمانے میں رہے گا باقی



کھڑے ہو کر یہ کام کیا۔ ایجنسیوں کی بھی پروانہ کی تپ
محببتوں سے ایسے کام کیے جاتے تھے۔ غیروں کو اپنا بنانے
والی مینا آپا اپنی ذاتی زندگی میں بہترین رفیقہ حیات اور شفیق
و مہربان ماں بھی تھیں۔ انھوں نے اپنے بچوں کی بہترین
تربیت کی۔ ان کے بچے انتہائی مہذب اور شائستہ اطوار کے
حامل ہیں۔ سبھی نے دنیاوی تعلیم کے ساتھ دینی تعلیم بھی
حاصل کی جس کی وجہ سے ماں باپ کے انتہائی فرمانبردار
واقع ہوئے ہیں۔ یہ سب ان کی اور ان کے شوہر سلام
صاحب کی توجہ اور محنت سے ممکن ہوا۔

سلام صاحب اور مینا آپا نے بہترین رفاقت کا دور
گزارا۔ اتنے پیارے اور محبوب شوہر کی وفات پر بھی میں
نے انھیں بہت صابر پایا۔ عدت بھی بہت خوبی سے گزاری
جو ایک مومنہ کی نشانی ہے۔

میں حقیر ناچیز سی بندی چاہتی ہوں کہ میرا ان سے اور
ان کے بچوں سے تعلق تاقیامت رہے۔ ان کے گھر اور ان
کے بچے آج بھی میرے راہنما ہیں۔ اللہ کرے میرا اور ان کا
رشتہ جنت میں بھی رہے۔ (آمین)

مینا آپا کی باتیں تو شاید کبھی ختم نہ ہوں۔ اگر مجھ سے
ان کے معاملے میں کوئی غلطی ہوگئی ہو یا میں نے ابلاغ کا حق
زیادہ یا کم ادا کر دیا ہو تو اللہ تعالیٰ مجھے معاف کر دے
(آمین)۔

آخر میں ان اشعار کے ساتھ میں اپنی بات ختم کرتی
ہوں جو مینا آپا نے مولانا مودودیؒ کی وفات پر لکھے۔
کوئی دنیا میں رہا ہے نہ رہے گا باقی

وہ زخمِ محبت کاری ہے

مینا آپا کے اپنے اشعار ہیں:

ہر زخمِ زمانہ بھرتا ہے
ہر دکھ کا مداوا ہوتا ہے
جو بھر نہ سکے تا عمر کبھی
وہ زخمِ محبت کاری ہے

انا للہ وانا الیہ راجعون)

مینا آپا (مرحومہ) کے بارے میں زہرا نہالہ کے علاوہ
دوسرے لوگوں نے بھی نہایت عمدہ اور صحیح لکھا ہے۔ مجھے ان
کے بارے میں صرف یہی کہنا ہے کہ وہ نبوی اخلاق کا نمونہ
تھیں اور ”نوباتوں کا حکم“ والی حدیث تو ان کے قول و فعل پر
بالکل صادق آتی تھی۔

دنیا سے جانے والے لوگ جن کے ساتھ گہرا
محبت بھرا تعلق ہو اور ان کی جدائی کا زخم ابھی بالکل تازہ
ہو اُس میں سے خون رستا ہو کیا یہ دکھ کم ہے کہ پھر
اُن پر لکھنے کیلئے بھی مجبور کیا جائے!

اللہ تعالیٰ اپنے خاص بندوں پر بڑا رحیم و شفیق ہے اتنی
کثیر اور طویل ملاقاتوں میں صرف ایک دفعہ ان کو غصے میں
آتے دیکھا جب المحسنات کے گیٹ پر گاڑی میں سے میں
اور زہرہ آپا تو اُتر چکیں، ان کے اُترنے کے دوران ڈرائیور
نے غلطی سے گاڑی چلا دی۔ وہ سنبھل نہ سکیں اور گر گئیں تب
انہوں نے ڈرائیور سے ذرا غصے کا اظہار کیا۔

یکم مئی 2011ء کو عمرہ پر جاتے ہوئے تین دن دوپہی
میں ٹھہرنے کا پروگرام تھا۔ تیسرے دن شارجہ میں بشریٰ تسنیم
نے اپنے ہاں ادبی میٹنگ رکھ لی جس کی اطلاع ہمیں چلنے
سے ایک دن پہلے ملی۔ ہم خوش تھے کہ چلو مینا آپا سے تین چار
ماہ بعد دوبارہ ملاقات ہو جائیگی مگر وہاں جا کر معلوم ہوا کہ
بشریٰ تسنیم مینا آپا کی دوبارہ دوپہی میں آمد سے بے خبر ہیں فوراً
ہی یعنی کوفون کیا مگر بار بار کوشش کے باوجود فون نہ ملا اس
طرح وہ شریک نہ ہو سکیں۔

مینا آپا نہایت مہذب، نرم و شفیق، معاملہ فہم اور زیرک
تھیں۔ دورانِ سانوں کے درمیان معاملات سلجھانے میں
بڑی ماہر تھیں شکایت کرنے والے کی بات کو مسکرا مسکرا کر پلٹتی
رہتیں ”اُس کا یہ مطلب ہوگا، شاید آپ کو سننے میں غلطی لگی ہو
آپ کو نہیں کسی اور کو کہا ہوگا۔“ اور آخر میں کہتیں ”ارے
بھائی چھوڑو پھر کیا ہوا معاف کر دو بڑا اجر پاؤ گی۔“ یہ ان
کے مزاج کا خاصہ تھا۔

16 مئی کو ہماری واپسی دوپہی ٹرانزٹ سے ہی ہوئی
میں انہیں ایئر پورٹ پر یاد کرتی رہی اور 19 مئی کو علی الصبح
زہرہ آپا نے روتے ہوئے ان کی فوتگی کی اطلاع دے دی)

مرکزی مجلس شوریٰ کے آغاز سے ہی منتخب رکن تھیں،

دیکھ بھال کر کئے بہت ہی خوش رہیں اور ادارے کو پھلتا پھولتا اور ذمہ دار ہاتھوں میں پا کر بہت دعائیں دیں۔
اللہ تعالیٰ ان کی اولاد کو صبر جمیل دے اور ان کے پیغام کو سنبھالنے والی بنائے (آمین)



نہایت پابندی سے اس میں شرکت کرتیں بحث و مباحثہ میں کبھی شور بھی مچ جاتا مگر انہیں معاملات سلجھانے کا فن آتا تھا۔ ہمیشہ اپنی باری پر ایسی دلیل سے بات کرتیں کہ سب اس نکتے پر متفق ہو جاتے۔ بڑی صائب الرائے تھیں لیکن اپنی بات منوانے کا انہیں کوئی بہت شوق بھی نہ تھا، بس پیش کر دیتیں آپا اُم اکبر کو ان کی باری ختم کرنے کے لئے کبھی اشارہ نہ دینا پڑتا وقت کے اندر اپنی مدلل بات ختم کر دیتیں۔

افہام و تفہیم کی عظیم ازدواجی زندگی میں ان کے آخری سات آٹھ سال بڑے کر بناک تھے اس سانچے کو انہوں نے اپنے دل پر لیا، کسی خاص راز دان سے شاید کبھی حال دل کہا ہو مگر اپنے لئے جو راستہ متعین کیا وہ خواہ کتنا کٹھن ہو چکا ہو، اُسی پر آخری دم تک دل و جان سے چلیں، شوہر سے کوئی ٹکڑ نہیں لی لیکن اپنے لئے جو عہد وفا باندھا اس پر قائم و دائم رہیں۔

ایک دفعہ مجھے خط میں لکھا کہ ادارہ بتول کی رپورٹ میں ماہنامہ نور کو باعثِ خسارہ پڑھ کر مجھے دل کی تکلیف سی ہو گئی ہے (نور اس وقت اشتہارات نہ ملنے کے باعث خسارے میں تھا) کچھ مشورے بھی دیئے اور کہا اس پر اس کی بانی حمیدہ بیگم کا نام لکھو۔

گزشتہ برس فیصل آباد سے خصوصی طور پر صرف ادارہ بتول کی میٹنگ میں شرکت کیلئے ایک رات سے پہلے لاہور آئیں زہرا ان کو ہر نئی صورت حال کی تفصیل بتا رہی تھی انہوں نے بحث طلب معاملات کو غور سے سنا، بڑے اچھے مشورے دیئے۔ جن چیزوں پر دستخط کرنے کی ضرورت تھی

.....کہہ دو مرے مرقد پہ اب

سے زیادہ اپنے بازو ننگے رکھے۔ بات اتنی حکمت سے ہوئی تھی کہ میرے دل میں اتر گئی پوچھنے لگیں کہ آپ کو میری بات بری تو نہیں لگی۔ میں نے کہا بالکل نہیں، الحمد للہ اس معاملہ میں اللہ نے مجھے وسیع ظرف سے نوازا ہے۔ کہنے لگیں شکر ہے میں نے ایک بہترین دوست کا انتخاب کیا ہے۔ میں گفتگو کے انداز اور الفاظ کے چناؤ میں گم ہو گئی۔ یہ راولپنڈی کی بہن طاہرہ ہارون مرحومہ تھیں۔ پھر ان سے تنظیمی پروگراموں میں اکثر ملاقات رہنے لگی۔ وہ ان دنوں راولپنڈی ڈویژن کی ناظمہ تھیں اور میرے پاس ملتان، بہاولپور اور ڈیرہ غازی خان کی معاونت تھی۔

ان کے جواں سال بیٹے کا حادثے میں انتقال ہوا تو ان کے صبر کو دیکھ کر میں دنگ رہ جاتی اور سوچتی کہ اتنا حوصلہ کہاں سے آتا ہے؟ ایک سال بعد راولپنڈی میں ملاقات ہوئی۔ ملتے ہی کہنے لگیں، شاہدہ، تم نے بتول میں جو نظم لکھی ہے نا ”لو! ایک برس پھر بیت گیا“ اس کو میں اس طرح پڑھتی ہوں ”لو! ایک برس تو بیت گیا۔“

یہ آپاجی ام زبیر مرحومہ قیمہ پاکستان اور صدر حریم ادب کی بیٹی تھیں۔ چند سال بعد طاہرہ ہارون بھی اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ آپاجی اس وقت حیات تھیں۔ میں ایک ماں کے دوہرے غم کا اندازہ لگانے کی ناکام کوشش کرتی رہتی۔

مینا باجی بھی اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ انا اللہ وانا الہ راجعون۔ ان سے پہلے قافلہ حق کی کیسی کیسی نابغہ روزگار ہستیاں چل بسیں۔ میں باوجود ان سے بے انتہا محبت کے اظہار کا حوصلہ نہ کر پائی۔ نجانے کیوں! میں کبھی دور اور کبھی قریب سے ان کو چاہت سے تکتی، ان کی قیمتی باتوں کو بہت غور سے سنتی، متاثر ہوتی اور ان جیسا بننے کی سعی ناکام کرتی۔ اکیلے میں بیٹھتی تو ان کے ساتھ گزرے شام و سحر کو ذہن کے کینوس پر اتارتی۔ ان شخصیات کی گونا گوں خصوصیات میرے لئے باعث تسکین ہوتیں اور ان کی رفاقت میں مجھے یوں لگتا جیسے میں کسی تپتے صحرا سے خوبصورت نخلستان میں آگئی ہوں، جیسے برسوں کے پیاسے کو اپنی پیاس بجھانے کے لئے کوئی سبیل مل گئی ہو۔ مینا باجی ہمیشہ کے گھر میں چلی گئیں اور بہت سوں کی یاد تازہ کر گئیں۔

حلقہ خواتین جماعت اسلامی میں میرے ابتدائی دنوں کی بات ہے۔ 1987، 1988ء کا دور تھا۔ پاکستان کی سطح پر مرکز خواتین منصوبہ میں بڑا پروگرام تھا میں ابھی پوری طرح فکر اسلامی کے سانچے میں نہیں ڈھلی تھی۔ وقفہ ہوا تو ایک شفیق سی خاتون میرے پاس آ کر بیٹھ گئیں۔ سلام دعا ہوئی، انہوں نے میری قمیض کے بازوؤں پر بہت خوبصورتی سے مجھے توجہ دلائی کہ عورت کے لئے جائز نہیں کہ ایک ہاتھ بھر

میرے دل کے تانوں بانوں کے ساتھ پیاروں کی رخصتی کا سلسلہ جاری رہا اور میں ان غموں کو پیتی رہی۔

مینا باجی! یہ سب آپ کی بھی تو سکھیاں تھیں۔ میں بڑے رشک سے ان ہستیوں کو آنکھوں کے رستے دل میں اتارتی رہی جنہوں نے جانے والوں کو ہٹکا تھا۔ بنت الاسلام کو میں ان کی تحریروں میں دیکھتی، باتیں کرتی، کبھی روتی اور کبھی اطمینان کا سانس لیتی کہ ذہنوں کی تطہیر اور مقصد زندگی کا شعور اور آخرت کی چاہت پیدا کرنے میں انہوں نے کتنا بڑا کردار ادا کیا ہے۔ یہ سب ان کے لئے صدقہ جاریہ ہی تو ہے۔

مینا باجی! آپ کی وساطت سے میں یہ حقیقت بھی آشکار کرتی چلوں کہ یکے بعد دیگرے تنظیمی ذمہ داریوں نے ایسا کوئی فرصت کا لمحہ نہ چھوڑا جس میں اپنے دل کے ارمانوں کو پورا کر سکتی اور وہ اس کے سوا کچھ نہ تھے کہ میں بیگم مودودی کی صحبت میں زیادہ سے زیادہ وقت گزاروں تاکہ ان سے مولانا مودودی کے بارے میں تبادلہ خیال کر سکوں۔ یہ خواہش حسرت نام تمام کی شکل میں دل کے نہاں خانے میں اب تک موجود ہے۔ آپ ان کو بتا دیجئے گا۔

وہ لمحہ بھی بہت خوشگوار تھا جب میری آپاجی نیر بانو سے ملاقات ہوئی تھی۔ دل میں سبائی ہوئی مثالی شخصیات کے معیار پر ہو بہو پورا اترتی شخصیت پا کر روحانی تسکین میرے اندر تک اترتی چلی گئی۔ نفیس لباس، خوبصورت گفتگو، مسکراتا چہرہ، میں کھینچتی چلی گئی۔ ایک قیمہ کا یہ دلکش روپ دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی۔ میرے تعارف پر بولیں، مجھے نفاست پسند لوگ

بہت اچھے لگتے ہیں۔ میں ہواؤں میں اڑنے لگی۔

مینا باجی! مجھے ان شخصیات کے ذریعے سے جماعت اسلامی سے عشق ہونے لگا۔ میں مالا مال ہونے لگی گویا ہفت اقلیم کی دولت ہاتھ آگئی ہو۔ ذمہ داریاں بڑھیں تو خوردبینیں لگ گئیں۔ تمام اہل خانہ زد میں آ گئے۔ بیٹیاں بہت اچھی طرح چادر سے ستر ڈھانپتی تھیں۔ میں زبردستی کی قائل نہ تھی۔ جماعتی تقاضے میرے سامنے رکھے جاتے۔ دیکھیں لوگ کیا کہیں گے ایک ذمہ دار کی بیٹیاں ہیں۔ آپاجی نیر بانو سے استفسار کیا، حالات بتائے، جواب ملا ”سختی بالکل نہ کرنا، محبت سے غیر شعوری طور پر مائل کرو۔ انشاء اللہ برقعہ بھی پہن لیں گی۔“ دل بالکل مطمئن ہو گیا۔ آہ! ایسی شفیق اور حکیم ہستیاں اب کہاں تلاشیں۔

مینا باجی! آپ کا تو ان تمام ہستیوں کے ساتھ بڑا گہرا تعلق ہے۔ آپاجی ام زبیر مرحومہ کے ساتھ آپ نے تحریر کی، تنظیمی اور ابدی سفر کی منزلیں طے کی ہیں۔ کیا انتھک خاتون تھیں۔ بے شمار خدمات، بیمار یوں کی آزمائش لیکن مجال ہے کبھی زبان پر حرف شکایت تو کجا، تذکرہ بھی آیا ہو۔ ترغیب اور تدبیر ان کے ہتھیار تھے۔ ان کے عزم، حوصلے اور بلند ارادے کو دیکھ کر جسموں میں بجلی سی دوڑ جاتی۔ ادب سے خاص شغف تھا۔ قلم کی روانی اللہ اللہ۔ ملتان میں ہم نے حریم ادب کا بڑا پروگرام کھا جس میں آپاجی مہمان خصوصی تھیں۔ نظم، غزل، افسانے سن کر پنجابی میں کہنے لگیں ”مرادل تاں کردا اے میں ملتان دی ساری کڑیاں نو چک کے کراچی لے جاواں“ (میرادل تو چاہتا ہے کہ ملتان کی ساری لڑکیوں

کو اٹھا کر کراچی لے جاؤں۔ ہماری ایک افسانہ نگار سے بولیں ”نی تو اردو ادب وچ ایم۔ اے کیتا اے“ (لڑکی! تم نے اردو ادب میں ایم اے کیا ہوا ہے؟) عمر کے آخری حصہ میں اکثر کہتیں ”ہن ای تے کم دی سمجھ آئی سی“ (اب جا کر تو کام کی سمجھ آئی تھی) ان دنوں وہ کینسر جیسے موذی مرض سے نبرد آزما تھیں۔ مینا باجی! آپ تو ان سب کی دیرینہ رفیق ٹھہریں۔

آپ کو دیکھ کر مجھے یوں لگتا جیسے ان سب کی خصوصیات آپ کی ذات واحد میں جمع ہو گئی ہوں۔

آپ سے تو میرے شناسائی کافی بعد میں ہوئی۔ آپ کو میں نے دو حوالوں سے دیکھا۔ حلقہ خواتین کی رکن اور حریم ادب کی سرگرم رکن کی حیثیت سے آپ کی شخصیت گونا گوں صفات کی حامل محسوس ہوئی۔ اور سب سے بڑھ کر تعارف جو غائبانہ رہا وہ ”نور“ کی وساطت سے رہا۔ خوبصورت پیرائیہ آغاز، حکیمانہ نصائح، دلچسپ راہِ عمل اور دعائیہ اختتام، بچوں کے ساتھ ساتھ بڑوں کی رہنمائی کرتا ہوا ”نور“ کا ادارہ اور بچوں کے لئے لکھی گئی نظمیں سب کچھ اب بھی دل پر نقش ہے۔ رسالہ ہاتھ میں آتے ہی اس کو زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچانے کی فکر لگ جاتی اور یہ احساس چین نہ لینے دیتا کہ کسی کی محنت شاقہ اور خون دل میں ڈبوئے ہوئے قلم کے احساسات میں ہم بھی شریک ہو جائیں۔

مینا باجی! مجھے یاد ہے سب ذرا ذرا۔ اور ہاں آپ کو بھی یاد ہوگا اور آپ تو اب رب کے حضور گواہی بھی دے چکیں۔

اللہ کے فضل سے شہادت حق بھی دی ہوگی جیسا کہ آپ اپنی پوری زندگی میں دیتی رہیں۔

جب حریم ادب پاکستان کی ذمہ داری مجھ ناچیز پر ڈال دی گئی تو میں روتی دھوتی آپ کے پاس ہی پہنچی تھی۔ بشریٰ تسنیم میرے ہمراہ تھیں۔ میں نے آپ کی کتنی منتیں کیں فریاد کی کہ مینا باجی اللہ کے واسطے آپ یہ ذمہ داری سنبھال لیں آپ ہی اس کی حقدار ہیں، میں بالکل نااہل ہوں، آپ مجھے جو کہیں گی میں کروں گی، میرا بھرپور تعاون آپ کے ساتھ ہو گا۔ لیکن میری ساری آہ و بکا بے سود ثابت ہوئی۔ اچھا مینا باجی رہنمائی تو کریں۔ ہدایات دیں کیسے کام کروں کیا کروں؟ ”شہرت سے بچنا، ہمارے بڑوں نے ہمیں یہی سکھایا ہے۔ اخبار و رسائل میں ذرا سی چیز چھپ جائے تو بڑی مسرت ہوتی ہے، انسان اپنے آپ کو کچھ سمجھنے لگتا ہے، ذرا تعریف ہوگی تو ذہن ہواؤں میں اڑنے لگا۔ یاد رکھنا یہ نام و نمود ہمیں مقصد سے دور لے جاتے ہیں، ان سے دور رہنا۔“ ان کی زبان حکمت کے موتی رول رہی تھی۔ میں نے ان تمام نصیحتوں کو پلو سے باندھ لیا۔

مینا باجی! میں ان پر عمل کی پوری کوشش کرتی ہوں۔ اور ہاں مینا باجی! بڑی زیادتی ہوگی اگر میں آپ کے ساتھ مل کر اس جگہ گاتی رات کا تذکرہ نہ کروں جس رات آسمان ادب کی کہکشاں منصورہ آڈیٹوریم کے ہال میں اتر آئی تھی۔ ہے نا! یاد آ گیا نا آپ کو۔ ہاں، ہاں وہی رات! جب ہم نے انتہائی ٹھوس صوبائی تربیت گاہ کے دوسرے روز ایک ادبی محفل سجا ئی تھی اور وہ یادگار بن گئی تھی کیوں کہ اس

پر جلوہ فرما تھے۔

سعیدہ احسن، مینا باجی آپ، ثریا اسماء، گائیکوں سے ٹیک لگائے بیٹھی تھیں ہم خوشی سے نہال تھے۔ میزبانی کے فرائض صائمہ اسماء ادا کر رہی تھیں اور شرکاء میں سمیہ مسعود عابدہ، فرزانه چیمہ، نسرين سحرش، بشری تسنیم، ڈاکٹر فائقہ، ڈاکٹر کوثر فردوس، رشیدہ قطب اور پنجاب کے مختلف شہروں سے آئی بہت سی قلمکار بہنیں شامل تھیں۔ پروگرام کا دورانیہ زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ گھنٹے تھا۔ دو گھنٹے گزر چکے تھے۔ انتظامیہ احساس دلا رہی تھی شرکاء اٹھنے پر تیار نہیں تھے۔ کبھی نظم، کبھی نثر، داد و تحسین کی بارش ہو رہی تھی۔ دلچسپی بڑھ رہی تھی۔ پورے دن کے تنظیمی کاموں میں تھکی ہاری ناظمات انتہائی خوشگوار موڈ میں جم کر بیٹھی تھیں اور وقت بڑھانے کا مطالبہ کر رہی تھیں۔ ہم سب خوشگوار حیرت میں مبتلا تھے۔ آخر انتظامیہ کے بجد اصرار اور اگلے دن کی تنظیمی مصروفیات کا سوچتے ہوئے بادل خواستہ پروگرام ختم کرنا پڑا۔ حلقہ خواتین کے افراد کے لئے عموماً اور حریم ادب کے ممبران کے لئے خصوصاً یہ لمحات ناقابل فراموش ہوں گے۔ اس ادبی محفل کی خاص بات یہ بھی تھی کہ ایک طرف حریم ادب کے روشن ستارے جلوہ افروز تھے تو دوسری طرف حلقہ خواتین کا تمام مرکزی اور صوبائی نظم بھی شریک تھا۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے دودھ اور شہد کی نہریں ساتھ ساتھ بہہ رہی ہوں۔ ایک ہی سمندر میں ایک ہی رخ پر ایک ہی منزل کی طرف اور یہ سارا منظر روحیں دو جسم ایک، دل دو دھڑکن ایک کا ثبوت پیش کر رہا تھا۔ راستے دو منزل ایک۔ مقصد اور حقیقی نصب

میں ناممکنات ممکنات بن گئے تھے۔ میرے پاس صوبہ پنجاب کی نظامت تھی۔ ہم نے پوری منصوبہ بندی کے ساتھ تین روزہ صوبائی تربیت گاہ میں سے کچھ وقت حریم ادب کے لئے مختص کر ہی لیا تھا۔ ملتان سے ہی اطلاعات کا سلسلہ جاری تھا۔ بشری تسنیم میری معاونت کر رہی تھیں۔ حریم ادب پاکستان کی ذمہ داری مجھے دی گئی تھی۔ ہم نے سرکلر میں ہی واضح کر دیا تھا کہ تمام ناظمات اپنے شہروں سے لکھاری بہنوں کو پوری تیاری کے ساتھ لے کر آئیں۔ سعیدہ احسن مرحومہ مہمان خصوصی اور مینا باجی! آپ صدر مجلس تھیں یاد ہے نا آپ کو، آپاجی زہرہ وحید سے مستقل رابطہ تھا کیوں کہ سعیدہ باجی اور آپ کو پروگرام میں لانے اور چھوڑنے کا بیڑہ انہوں نے اٹھایا تھا۔ یہ کافی کٹھن کام تھا۔ سعیدہ باجی اور آپ کے معمولات کے خلاف بھی۔ اپنی اپنی خرابی صحت کی وجہ سے رات کا نکلنا آپ دونوں کے لئے ناممکن تھا۔ محترمہ زہرہ وحید صاحبہ نے اس کٹھن کام کا بیڑہ اٹھایا اور خوب نبھایا۔ واہ زہرہ آپا واہ! آپ نے ایک یا گار کارنامہ سرانجام دیا تھا اور ہم سب تو خوشی کے مارے پاگل ہو رہے تھے۔ سٹیج قہقہوں سے جگمگا رہا تھا۔ شمعیں روشن تھیں۔ لا جواب فرشی نشست گائیکوں کے ساتھ آراستہ تھی۔ خوشبوؤں سے ہال مہک رہا تھا۔ سٹیج پر بڑے بڑے بینر آویزاں تھے جن پر حریم ادب کا سلو گن ”ادب برائے زندگی، زندگی برائے بندگی“ جگمگا رہا تھا اور اس تمام آرائش و زیبائش سے بڑھ کر دل و دماغ کو معطر کرنے والی خوشبو اور حقیقی جگمگا ہٹ تو ان ستاروں کی تھی جو ان سب سے نمایاں مجسم صورت میں نگاہوں کے سامنے سٹیج

العین کا کیا حسین امتزاج تھا۔

اور آپ جیسے لوگوں کے سر ہی تو جاتا ہے۔ جنہیں دیکھ نہ پائے انہیں تحریروں میں جانا اور جن کو دیکھا انہیں خوب پایا۔ ان کے حسنت اپنانے کی کوشش کی مہربان رفاقتوں نے انگلی پکڑ کر چلنا سکھا دیا۔ خدا کرے ہم بھی اس قرض کو ادا کرنے والے بن جائیں۔

مینا باجی آپ یقین کریں میں نے تو زبان دانی بھی آپ سے سیکھی۔ الفاظ کا چناؤ یا تلفظ، عبور، معنویت، مقصدیت، گہرائی اور روانی غرض اردو گرامر کی تمام خوبیوں کا مرقع آپ تھیں۔ گفتگو اور عبارت کو چار چاند لگ جاتے۔ اپنے محسنوں اور قابل تقلید نمونوں کا عکس آہستہ آہستہ میرے اوپر بھی رنگ چڑھاتا چلا گیا۔ میں بھی آپ کی نقل کی کوشش کرتی ہوں۔ یہ غلط تو نہیں ہے نا!

مجھے یاد ہے مرکزی شوری کا اجلاس تھا جب میں نے آپ کو پہلی دفعہ دیکھا تو دیکھتی رہ گئی۔ آپ میں کوئی عجیب اور منفرد بات ایسی ضرور تھی جو دوسروں میں نہ تھی۔ مجھے بچپن سے سنجیدہ، ذہین اور متین لوگوں سے انسیت رہی ہے۔ آپ میں یہ تینوں خوبیاں موجود تھیں۔ آپ کا چہرہ اس کا غماز تھا۔ کشادہ پیشانی، روشن آنکھیں، مسکراتے لب، رعب اور دبدبہ کی وجہ سے جلدی قریب ہونے سے قاصر رہی۔ کچھ فطری جھجک آڑے آئی اور یوں میں دور دور سے آپ کو پسندیدگی سے دیکھتی رہی۔

دوران اجلاس میں سب کی گفتگو ہی بہت توجہ سے سنتی تھی لیکن آپ کی بات لا جواب ہوتی۔ آپ مختصر، مدلل، جامع اور سنجیدہ بات کرتیں جو ہمیشہ موضوع سے متعلق ہوتی۔

مینا باجی! یہ رات یقیناً آپ کو بھی یاد رہی ہوگی۔ میں آپ کو اور سعیدہ باجی کو بہت خوش دیکھ رہی تھی اور میرے لئے تو قابل فخر یہی بات تھی کہ میں آپ جیسے تاریخی افراد کے قافلے میں محو سفر ہوں۔

مینا باجی! مجھے آپ جیسی ہستیوں کی جلوت اور خلوت نے بہت رہنمائی دی ہے۔ سفر و حضر میں آپ لوگوں سے میں نے بہت کچھ سیکھا ہے۔ خطابات اور تقاریر کی بجائے عملی نمونوں کو دیکھ کر میں نے جو متاع سینہ بہ سینہ حاصل کی ہے وہ میرے لئے حاصل زیست اور سرمایہ آخرت ہے۔

مینا باجی! مجھے پنڈی کا وہ پروگرام بھی یاد ہے جو غالباً مرکزی یا صوبائی شوری کا پروگرام تھا۔ کسی رکن کے گھر میں ٹھہرے تھے۔ آپ بھی ہمارے کمرے میں ہی مقیم تھیں۔ ملحقہ کمرے سے بہت ہی شوخ، سریلی اور خوبصورت آواز نے آپ کو متوجہ کر لیا اور آپ یہ کہتے ہوئے ادھر گئیں اور کسی کے گلے لگ گئیں کہ ”یہ کس کوئل کی آواز ہے۔“ دوسری طرف سے برجستہ جواب ملا ”میں بھی کہوں یہ کون شناسا آن پہنچا“ ان خوبصورت اور اپنائیت سے بھرپور جملوں سے میرے اندر بھی محبت کے زمزمے بہنے لگے۔ پتہ چلا یہ سلمی یا سمین نجی ہیں۔ مجھے تو ہر ملنے والے نے اک خوبصورت اور اچھوتے انداز میں اجتماعیت سے روشناس کروایا اور یوں میں روایتی طریقوں سے گھبرانے والی بڑی محبت اور دلچسپی سے اپنے غیر متعلق مشاغل چھوڑ کر مشکل ذمہ داریاں شوق سے نبھانے کا فن سیکھتی چلی گئی۔ مینا باجی! یہ سارا سہرا آپ

اور اٹھکیلیاں کیا کرتے تھے۔ ہمیں خبر تھی کہ دل و نگاہ میں محبت کے دیپ جلانے کچھ لوگ ہمارے لئے دعا گو ہیں۔ مینا باجی! میں آپ کی زندگی میں کبھی بھی آپ کے لئے اپنے دل میں موجود ٹھانٹیں مارتے محبت کے جذبات کو عیاں نہ کر سکی۔ نجانے کیوں مجھے یہ محسوس ہوتا تھا کہ آپ کو ناگوار نہ گزرے اور محبت کا یہ بھرم کھل نہ جائے۔ میں اس کو زندہ رکھنا چاہتی تھی۔

لیکن مجھے پورا یقین ہے کہ یہ زبردست ریڈیائی لہریں آپ تک ضرور پہنچی ہوں گی، آپ اس کی گواہ رہیں گے گا آپ اپنی ساتھیوں کو بھی میرا پیغام محبت دیتے گا۔ وہ طاہرہ ہارون ہوں، ام زبیر، نیر بانو، بلقیس صوفی، صغریٰ فاطمہ یا پوری امت کی جمع ہونے والی تمام سعید اور شہید روحیں، میرا ان سے بہت گہرا تعلق ہے۔ ان سب کو میرا سلام کہیے گا۔ آپ ہم سے پہلے پہنچ گئی ہیں اور ہم آپ کے پیچھے آنے والے ہیں۔ مینا باجی! رب کا پیغام لافانی اور آفاقی ہے۔ ہم اس دنیا میں اسی کے علمبردار ہیں۔ آپ نے یہ فریضہ بخوبی ادا کیا ہے اور یہ آپ کے لئے میری گواہی ہے۔ اللہ آپ پر اپنی رحمتیں نازل کرے۔ جلد ملیں گے، انشاء اللہ اللہ بہترین جگہ پر ہم سب کی ملاقات کرے۔ (آمین)

دل میں رہی جو آرزو، کہہ دو مرے مرقد پہ اب

جو کہہ نہ پائے رو برو، کہہ دو مرے مرقد پہ اب



آپ کو جماعت اسلامی سے کتنی محبت تھی اس کا اندازہ مجھے اس وقت ہوا جب رپورٹ سیشن میں ارکان کی موجود تعداد سن کر آپ کی حالت غیر ہو گئی اور میں حیرت کے سمندر میں ڈوب کر رہ گئی کہ کوئی اپنی جان سے بھی زیادہ اسلامی اجتماعیت سے محبت کر سکتا ہے۔ جی ہاں اور وہ آپ تھیں مینا باجی آپ۔ آپ ایک ہی بات دہرائے چلے جا رہی تھیں ”ارے اتنا عرصہ ہو گیا جماعت کو، ہمیں کام کرتے ہوئے صرف اتنی ہی خواتین رکن بنی ہیں“ آپ انتہائی رنج و الم سے دو چار تھیں اور یہ بات دل پر لے لی تھی۔ ڈاکٹر کوثر فردوس قیمہ پاکستان تھیں۔ انہوں نے فوراً تسلی دی اور کہا ”مینا باجی! مرد ارکان بھی تو ہیں اور آپ آگے بھی تو رپورٹ سنئے، امیدواران، کارکنان، متعین، متفقین اور ممبران کی تعداد سینکڑوں، ہزاروں اور لاکھوں میں ہے۔ اور میں مینا باجی میں بھی آپ کو دیکھ کر لذت آشنائی کے رنج و الم کو اپنے سینہ میں اتارنے کی کوشش کرتی۔

مینا باجی! اللہ تعالیٰ نے مومنات کی جو صفات اپنی کتاب پاک میں ذکر فرمائی ہیں وہ بدرجہ اتم آپ میں موجود تھیں۔ دستور جماعت اسلامی میں ایک رکن کی جو صفات درج ہیں آپ حقیقی معنوں میں ان پر پورا ترتی تھیں۔

آپ صاحب علم، متقی اور صائب الرائے خاتون تھیں۔ آپ ”نور“ کا منارہ تھیں۔ آپ ادب کا شاہ بلوط تھیں، آپ کو دیکھ کر طمانیت کا احساس ہوتا تھا۔ آپ جیسی ہستیوں کی سرپرستی اور موجودگی کے احساس سے ہم جیسے نادانیاں

وہ جو میرے دل کے قریب تھیں

تیر کی طرح دوڑ کر سلائی مشین کے پاس پہنچی امی نے میرا تیار شدہ غرارہ مشین پر پھیلا کر سجایا ہوا تھا۔ کلا بتو کی ڈوری اور گوٹے کی پتیوں کی مدد سے غرارے کی گوٹ پر پھولوں کی چھڑیاں بھی بنی ہوئی تھیں۔ میں دوڑ کر امی سے لپٹ گئی۔ امی آپ نے کیسے اتنے تھوڑے وقت میں اتنا اچھا غرارہ تیار کر لیا!!

میں نے ہمیشہ امی کو راتوں کو جاگ کر کام کرتے دیکھا کپڑوں کی سلائی سے لے کر نور کے کام تک۔ اور دن بھرا می کے گھر کے کام اور جماعت کے کام چلتے۔

میں نے چھ سات سال کی عمر میں روانی سے اردو پڑھنا سیکھ لی تھی بہت کم عمری سے ہی امی نے مجھ سے، نور کے کام میں مدد لینا شروع کر دی تھی۔

میرا کام ہوتا کہ ڈاک کھولتی جاتی۔ اگر اندر سے کہانی نکلتی تو اس کو کہانیوں والی فائل میں رکھ دیتی اگر لطیفے یا پہیلیاں نکلتے تو اس کو ان کی متعلقہ فائل میں رکھ دیتی۔ اس طرح sorting یعنی چھانٹی کا کام میرے ذمہ تھا۔

ذرا اور بڑی ہوئی تو امی نے ڈیوٹی لگا دی کہ کہانی پڑھو۔ اگر بہت اچھی لگے تو ایک کونے پر لکھ دو کہ بہت اچھی ہے اگر درمیانی یا معمولی لگے تو وہ بھی کونے میں لکھ دو (اس طرح امی کو شاید کچھ آسانی ہو جاتی ہوگی) مجھے یہ کام بہت

ماں بیٹی کا رشتہ اللہ نے کیسا انوکھا اور پیارا بنایا ہے۔ لفظوں میں اس کی خوبصورتی و گہرائی کو سمویا نہیں جاسکتا۔ صرف محسوس کیا جاسکتا ہے۔ غالباً ہر بیٹی ہی اس رشتے کی لطافت، نرمی، گرمی، شرمیلی اور مشفق خوشبو کو اپنی پور پور میں رچا محسوس کرتی ہوگی۔ لیکن امی کے ساتھ میرا تعلق اس سے ایک قدم آگے بڑھ کر استاد، شاگرد، مرشد، مرید اور دوست، ہمد، غمگسار اور سہیلی میں ڈھل گیا تھا۔

مجھے امی کی ہر چیز اچھی لگتی۔ امی کی شخصیت امی کا انداز، امی کی گفتگو، امی کی مصروفیتیں، امی کی جماعت، امی کی ملنے والیاں، امی کی شاعری، امی کی حساسیت یہاں تک کہ امی کی ڈانٹ بھی مجھے بڑی اچھی لگتی۔

امی کے حوالے سے میری اولین خوبصورت یاد انکا عید کے موقع پر میرے لئے سبز رنگ کا غرارہ سینا ہے، چاند رات تھی۔ امی غالباً باورچی خانہ میں مصروف رہی ہوگی۔ میرا غرارہ نامکمل حالت میں مشین کے اوپر پڑا تھا۔ میں بار بار امی کے پاس آ کر پوچھتی، امی صبح عید ہے صبح تک میرا غرارہ مکمل ہو جائے گا نا؟ اور امی مجھے بار بار تسلی دیتیں کہ صبح جب تم اٹھو گی تو تمہارا غرارہ تیار ہوگا انشاء اللہ۔ میں نجانے کس وقت انتظار کرتے کرتے سو گئی۔ صبح فجر کی نماز کی چہل پہل سے آنکھ کھلی۔

دلچسپ لگتا۔ پڑھنے کا مجھے قدرتی طور پر جنون کی حد تک شوق تھا۔ امی تحریروں کے حوالے سے میری رائے کو خاص اہمیت دیتیں۔ میں تصور ہی تصور میں اپنے آپ کو ایڈیٹر باجی، ہی سمجھتی۔ امی کے ساتھ نور کے کام میں معاونت میں نے مارچ 2001 تک نبھائی جب کبھی امی بہت تھکی ہوتیں تو نور کی محفل میں جوابات بھی میں لکھ دیتی اور کبھی کبھی امی کے بتائے نکتہ پر ادارہ بھی لکھ دیتی۔

امی کی فرمائش پر میں نے Mystery of the burnt cottage کا ترجمہ، پراسرار آگ، کے نام سے کیا یہ ناول قسط وار نور میں چھپا اور بچوں نے اسے پسند کیا جب کبھی میری کسی کہانی یا مضمون کے حوالہ سے کوئی پسندیدگی کا خط آتا تو حوصلہ افزائی کرنے کو امی مجھے ضرور بتاتیں یہی وجہ ہے کہ نور اور بتول کی محبت میری رگوں میں خون کی طرح دوڑتی ہے۔

امی میرے مطالعے کے شوق سے خوش ہوتیں حوصلہ افزائی کرتیں لیکن ساتھ ہی ساتھ ان کا اصرار ہوتا کہ جو پڑھا اور سمجھا ہے وہ مجھ سے ڈسکس کرو۔

اس طریقہ کار سے غیر ارادی طور پر مجھے اپنا ماضی الضمیر بیان کرنے کا سلیقہ آیا اور ساتھ ہی ساتھ ہر تحریر میں چھپے مقصد کو سمجھنا اور تحریر کے مضمرات کو جانچنا آیا۔

یوں میں نے Enid Blyton سے لیکر اگا تھا کر سٹی تک باربرا کارٹ لینڈ سے لیکر جین آسٹن تک، برنارڈشا کے مین اور سپر مین سے لیکر Ibsen کے ڈول ہاؤس تک کیٹس، شیلے، ملٹن سے لیکر Ted Hughes تک saift اور

ہکسلے سے لیکر ٹی ایس ایلینک تک میں نے ہر ایک کو امی سے خوب خوب ڈسکس کیا۔ Donne کے میٹافزکس اور ایلینک کے، ویسٹ لینڈ، کو سمجھنے میں امی میری مقدور بھر مدد کرتیں۔ میرے ساتھ اتنی گفتگو اور بحث مباحثہ سے بقول امی، مجھے لگتا ہے میں نے تیرے ساتھ ایم اے انگلش کر لیا ہے اور لطیفہ یہ ہوا کہ ایک دفعہ بہاولپور میں انگریزی کی پروفیسر عذرا یاسمین صاحبہ امی سے بات کرتے کرتے پوچھنے لگیں کہ مینا آپا آپ نے انگریزی میں ایم اے کب کیا؟

یہ بات سناتے وقت امی خوب ہنستیں۔ انگریزی ادب کے حوالے سے امی کی گفتگو کا حاصل کلام یہ ہوتا کہ ”انگریز چونکہ آقا تھے اور ہم غلام، اس لئے ان کے ادب کو اس قدر بانس پر چڑھایا گیا اور نہ حقیقت میں جو سرمایہ ہمارے پاس فارسی اور اردو ادب میں موجود ہے۔ وہ انگریزی ادب سے بدرجہا بہتر اور بالغ ہے۔“

امی مجھے شروع ہی سے خاندان کی باقی خواتین سے منفرد لگتیں میں نے بچپن ہی سے دیکھا تھا کہ امی کام کرتے کرتے گنگنا نے لگتی ہیں پھر کچھ دیر بعد کاغذ قلم منگواتی ہیں اور اس پر کچھ لکھتی ہیں۔ ذرا سمجھدار ہونے پر پتا چلا کہ یہ تو امی پر اشعار کی آمد ہوتی ہے اور انہیں امی کام کرتے کرتے لکھتی رہتی ہیں شعر لکھنے کے بعد امی ایک دفعہ مجھے سناتیں ضرور اور پوچھتی کہ کیسا لگا؟ پہلے تو مجھے کوئی خاص سمجھ نہ آتی ہاں دل ہی دل میں امی کی خداداد صلاحیت پر حیران ضرور رہ جاتی۔ پھر ذرا شعور میں بالیدگی آئی تو میں زور و شعور سے تعریف کرتی، کوئی لفظ سمجھ نہ آتا تو پوچھ بھی لیتی مثلاً خم کا کل سے کیا

مراد ہے وغیرہ، لیکن میں امی سے یہ ضرور کہتی کہ امی آپ کی طبیعت میں اتنا سوز کیوں ہے؟

امی کہتیں کہ یہ سوز تو انسان کی فطرت و مقدر میں لکھ دیا گیا ہے (بحوالہ ابتدائے مثنوی مولانا روم، جہاں وہ بانسری سے پوچھتے ہیں کہ تیرے اندر اتنا سوز کیوں ہے)

امی اپنے بچپن کا حال سناتے ہوئے اکثر بتاتیں کہ میری شخصیت کو بنانے میں 4 کتابوں نے بنیادی کردار ادا کیا شیخ سعدی کی گلستان اور بوستان، مثنوی مولانا روم اور پندنامہ فرید الدین۔

امی سے والہانہ تعلق نے مجھ سے ہر وہ کام کرایا جو امی کو پسند تھا۔ وہ کسی بات کے لئے پسندیدگی کا اظہار کرتیں اور میں اسے کرنا اپنے اوپر فرض کر لیتی۔

میں نے انگریزی ادب امی کی خواہش کے پیش نظر پڑھا۔ امی ہر وقت گلستان بوستان کا ذکر کرتیں۔ میں نے بی اے میں فارسی بطور آپشنل مضمون کے صرف اسی لئے رکھا اور امی سے گلستان کی حکایتیں اور پیام مشرق کی نظمیں پڑھیں، پڑھائی سے فارغ ہو کر امی کا دل چاہتا کہ مجھے کشیدہ کاری کروشیا، سویٹر بننا اور کپڑے سینا آنا چاہئیں۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ امی نے کبھی اپنے کپڑے درزی سے سلوائے ہوں یا شادی سے پہلے تک کبھی ہمارے کپڑے سلنے کو دیئے ہوں۔ عینی باجی تو خیر بہت اچھے کپڑے سی لیتیں تھیں میں بھی شلواری قمیض سی لیتی گلا البتہ امی سے بنواتی۔

امی کو کتابیں پڑھنے کا شوق تھا ہم نے امی کی حوصلہ افزائی پر گھر کے قریب واقع، دیال سنگھ لائبریری کا چلڈرن

سکیشن اور ادبی حصہ چاٹ ڈالا۔

میں دنگے فساد سے کوسوں دور بھاگتی مگر امی کے حکم پر کئی دفعہ پولنگ ایجنٹ بھی بنی 1993 میں میری شادی ہو چکی تھی امی سے ملنے لاہور گئی ہوئی تھی اسلامک فرنٹ کی طرف سے ایوب میر صاحب کھڑے تھے مقابلہ نواز شریف سے تھا انتخابی و سیاسی حالات نہایت ناگفتہ بہ تھے مگر صرف امی کے اصرار پر میں اور عارفہ دیال سنگھ کالج میں واقع پولنگ بوتھ پر بطور پولنگ ایجنٹ بیٹھیں۔

خاندانی منصوبہ بندی کے امی سخت خلاف تھیں۔ باتوں باتوں میں اس کے خلاف دلائل دیتی رہتیں اللہ نے اپنی عنایت خاص سے مجھے چار بیٹے اور 3 بیٹیاں عطا فرمائیں (الحمد للہ) میں کبھی کبھی شرارت سے امی سے کہتی کہ دیکھ لیں اس معاملے میں بھی میں نے آپ ہی کی بات کو اہمیت دی ہے۔

ہر بچے کی پیدائش کے موقع پر امی نے میری خدمت اور ہمت بندھانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ جڑواں بچوں کی پیدائش کے موقع پر وہ مسلسل چار ماہ دن رات میرے ساتھ لگی رہیں۔ بچوں کو بے جا ڈانٹ ڈپٹ کرنے، غصہ کرنے سے ہمیشہ روکتیں مجھے اللھم اعنی بالصلم، وزینا بالصلم واکرمنی بالتقویٰ واجملنی بالصلحہ تلعین کرتیں۔

2001ء اپریل سے میں نے امی کے مشورے اور ہدایت کے مطابق جماعت اسلامی حلقہ خواتین میں عملی سفر کا آغاز کیا۔ میں اہل فیصل آباد کی اس محبت کی تاحیات مقروض

رہوں گی جو انہوں نے مجھ پر ”مینا آپا“ کی بیٹی ہونے کے ناطے نچھاور کیں۔

آخری چند سالوں سے اب میری اور امی کی گفتگو کا محور قرآن پاک کی آیات و موضوعات ہوتا۔ میں امی کو اپنی فہم قرآن کے اسباق کی تیاری سناتی۔ ایک ہی آیت کو مختلف مفسرین نے کس کس طرح بیان کیا ہے میں امین احسن اصلاحی صاحب اور سید قطب شہید کی تعریف کرتی کبھی مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کی تفصیلات کا ذکر کرتی مگر امی آخر میں اپنے مخصوص انداز میں کہتیں کہ ”مولانا مودودیؒ“ کا انداز بہت عام فہم ہے۔

میں نے محمود احمد غازی کی محضرات قرآنی، شاہ ولی اللہ کی حجتہ للہ بالغہ، ابن جوزی کی منہاج القاصدین، سید اسعد گیلانی مرحوم کی مسافران عدم اور اشفاق احمد کی زاویہ (کتابی صورت میں) امی کے ساتھ بڑی دلچسپی سے پڑھیں آخری بار امی نومبر 2010 میں میرے پاس آئیں اور جنوری 2011ء تک رہیں۔ اس دفعہ امی بہت کمزور ہو گئی تھیں۔ دل بھی بہت رقیق ہو گیا تھا۔ یادداشت بھی متاثر تھی۔ اکثر چلے جانے والوں کو یاد کرتی رہتیں اپنی والدہ اماں بی بی، بھائی شفیع احمد خاں، اپنے چچا نواب سخاوت علی خاں، چچا زاد بھائی بہنوں اور خاص طور پر بنارس والی چچی بی بی کا ذکر کرتیں جنہوں نے یتیمی میں امی اور ان کی والدہ کا بھرپور ساتھ نبھایا تھا۔

جماعتی حلقے سے اٹھتے بیٹھے آپا حمیدہ بیگم اور آپا زبیدہ بلوچ کو یاد کرتیں۔ کبھی ڈاکٹر اختر حیات بٹ، سمعیہ سالم،

قائدہ رابعہ، عاصمہ غنی، کوثر فردوس، زہرا عبد الوحید صاحبہ اور کبھی 199 شاد باغ والوں کو کے بارے میں نام لے لے کر پوچھتیں۔ جب کبھی ڈاکٹر فوزیہ ناہید اور ڈاکٹر عذرا بتول کا ذکر ہوتا تو بیگم زبیدہ واصل کی بیٹیوں اور مزین سلیم کا پوچھتیں نیر بانو، نمبر پڑھ کر آپا نیر بانو، بلقیس صوفی اور آپا ام زبیر کو یاد کرتیں، ہر وہ فرد جس نے امی کے ساتھ محبت، خلوص کا رشتہ استوار کیا تھا اسکے لئے امی کے لبوں پر دعائیں مچلتی رہتیں۔

رشتہ داروں میں اہلیہ ناصر سلطان صاحبہ کے محاسن کا خصوصیت سے ذکر کرتیں۔ ہمارے اباجی مرحوم کا ذکر کر کے آبدیدہ ہو جاتیں۔ کہتیں کہ اللہ نے میرا واسطہ بڑے نیک آدمی سے ڈالا تھا، میں اس پر اللہ کا جتنا شکر ادا کروں کم ہے امی کی یادداشت ضرور متاثر ہوئی تھی مگر عقل و فہم میں الحمد للہ کوئی فرق نہ آیا تھا۔ سیاسی حالات اور خصوصاً امریکہ کے حوالے سے گفتگو ہوتی تو امی ایک ہی بات کہتیں کہ دشمن اگر قوی است، نگہبان قوی ترست۔

امی کے ساتھ آخری کتاب ڈاکٹر بشیر محمود کی حیات بعد الممات پڑھی۔ روح و نفس کی حقیقت پر تفصیلی گفتگو ہوتی، کہتیں کہ موت کا زیادہ سے زیادہ ذکر و خیال کرتی رہو خوف میں کمی آتی جائے گی۔ امی کہتیں کہ مرنا بے شک آسان کام نہیں مگر مجھے اپنے رب کی رحمت پر یقین ہے میں نے اپنی زندگی کے ہر قدم پر اس کی رحمت و عنایت کو محسوس کیا ہے کیا اب وہ مجھے چھوڑ دے گا؟ (یقیناً نہیں) امی کی پسندیدہ دعا یہ تھی

فاطر السموات والارض انت ولي في الدنيا خیر بنی دل کو موہ لیتی تھی!

ہوا کی سائیں سائیں میں نوے کی آہیں ہیں۔ دین و سنت قائم کرنے کی دھن اور لگن نے جس ہستی کو مجنوں بنا رکھا تھا اس کی آنکھیں تو بند ہو گئیں، نبضیں ڈوب چکیں..... اب ہم ہیں اور ہمارے دل کے ویرانے..... اب ان ویرانوں پر کیا گزرے گی، ہم کچھ نہیں کہہ سکتے!

تیرگی بڑھ گئی ہے لو کچھ اور
بڑھتا جاتا ہے غمکدے کا شور
بجھ گئی شمع گھپ اندھیرے میں
اور طوفان کا دم بدم ہے زور
(انجم)



والاخرة توفني مسلماً والحقني بالصلحين

آخری دفعہ رخصت ہوتے وقت کہنے لگیں ”کام میں لگی رہو مجھے اب وہ وقت بہت قریب محسوس ہو رہا ہے گھبرانا مت، بس آسانی کی دعا کرتی رہنا۔“ اور رحمان و رحیم رب نے کیسی آسانی کر دی، الحمد للہ، سبحان اللہ! میں تو لاشعوری طور پر اس جدائی کی منتظر تھی لیکن جب یہ حادثہ حقیقتاً گزرے گا تو دل و دماغ کا کیا حال ہوگا میں نے تصور بھی نہ کیا تھا۔

محترمہ نیر بانو مرحومہ کے لکھے، ویرانے کا نوحہ، پر میری نظر پڑی جو انہوں نے آپا حمیدہ بیگم کی رخصتی پر لکھا تو مجھے یوں لگا کہ میرے احساسات کو زبان مل گئی۔ میں نے 25 سال کے بجائے 40 سال کی تبدیلی کی ہے بس.....

”ہماری تو چالیس سال کی رفاقت اور دوستی تھی یہ کیا ہوا برسوں کا رشتہ دم کے دم میں توڑ کر رکھ دیا ایسا منہ چھپایا کہ اب ملنا قیامت ہو گیا۔ کیا اسی کو دوستی کہا جاتا ہے؟ کیا یہی شرط وفا تھی؟ اور منزل بھی وہ چنی جس کی طرف قدم بڑھ تو سکتے ہیں مگر واپسی کی راہیں نہیں.....

اور معلوم ہے دل کے ویرانوں پر کیا گزر رہی ہے..... جیسے صحرا میں پتھر بکھرے ہیں، خشک ریت کے گولے ہیں..... دھوپ کی جلن ہے، سورج کی جھلسا دینے والی چمک ہے۔ کوئی آڑ اور اوٹ نہیں، وہ نرم نرم باتوں کی بدلیاں نہیں، برساتی پھواریں نہیں جو لمحوں میں دکھ درد کی تلخیوں کو دھو دھلا کر صاف ستھرا کر دیتی تھیں.....

وہ باتیں اب کہاں سننے کو ملیں گی جن کی دل نشینی او

جس کے دم سے تھی رونق محفل

Fascinate کرتیں گرمیوں میں روٹی بناتے ہوئے سر سے
پیر تک پسینے میں بھیگی ہوتیں اور وقفے وقفے سے اپنے ماتھے کا
پسینہ صاف کرتیں تو مجھے بڑا پیارا لگتا اور اسی چکر میں نے
بارہ تیرہ برس کی عمر سے شام کی روٹی بنانا زبردستی اپنے ذمے
لے لی، پھر جب میرا پسینا گرتا تو مجھے وہ روحانی لذت اور
خوشی ملتی جو بعد میں کبھی نہ محسوس ہوئی کہ ”میں امی جیسی
ہوں“

امی کبھی بھی ادبی، دعوتی یا جماعتی کاموں کے لئے گھر کو
یکسر نظر انداز نہ کرتی تھیں، اُن کی اولین ترجیح اُن کا گھر
، شوہر اور بچوں کی تربیت تھی اور ہمیں ہمیشہ شادی کے بعد اسی
بات کی تلقین کرتیں کہ ”تمہارا اصل کام یہ ہے، دوسرے کام
ساتھ ساتھ لے کر چلا کرو۔“

منصورہ میں چاہے اجتماع عام ہو یا خاص میں اور میری
بڑی بہن زہرا ہمیشہ امی کے ساتھ ہوتے، اباجی عبدالسلام
خان حلقہ خواتین کے نگران تھے اور ہم دونوں پیغام رسانی کا
کام سرانجام دیتے۔

اجتماع کیلئے چاہے دریاں بچھانی ہوتیں، ناشتہ تقسیم
کروانا ہوتا یا مردان خانے میں احسان صاحب کو کوئی پیغام
دینا ہوتا امی ہمیشہ مجھے ہی دوڑاتیں اور یوں وہ ہماری عملی
تربیت کرتیں۔ سب باتوں کے باوجود اکثر لوگوں کا خیال تھا

شع خاموش بزم ویراں ہے
آنکھ غم ناک دل پریشاں ہے
اب اسے ڈھونڈنے کہاں
جائیں
جو پس پردہ ہم سپنہاں ہے
جس کے دم سے تھی رونق
محفل

وہ کہاں آج راحتِ جاں ہے

السلام علیکم امی جی ”اٹھائیسویں سیڑھی پر قدم رکھ کر
میں اسکول سے واپسی پر با آواز بلند نعرہ لگاتی۔ اٹنیسویں اور
تیسویں پر چھلانگ لگا کر میں باورچی خانے میں داخل ہوتی
جہاں امی روز کے معمول کے مطابق کام میں مصروف ہوتیں
، کبھی آٹے میں سنے ہاتھوں کے ساتھ، کبھی برتن دھوتے
ہوئے صابن کے ساتھ پسینے میں نہائی ہوئی امی اس والہانہ
انداز میں جواب دیتیں اور مسکرا کر ملتیں گویا سب سے زیادہ
انہیں میرا ہی انتظار تھا۔ میں برس ہا برس اسی طرح اسکول
سے آتی اور اُن کو ہمیشہ وہیں پاتی ”امی سخت بھوک لگ رہی
ہے“ امی ہمیشہ کہتیں ”بیٹا ہاتھ دھولو اور کھانے کے لئے آ جاؤ
۔“ ان کے انداز میں نرمی، محبت اور اپنائیت ہوتی۔

مجھے امی باورچی خانے میں کام کرتی بہت

رنگ بھر دیتا۔

اسی حوالے سے شاعری سے پہلے پانچ سالہ قیام بہاولنگر امی کی نوجوانی کا سنہری دور تھا۔ ہمارے ماموں ناصر سلطان علی خان سول انجینئر تھے اور محکمہ انہار میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھے وہاں کی وسیع و عریض کوٹھی اور اس کے سامنے سے بہتی نہر، امی کی من پسند جگہوں میں سے تھی جہاں ماحول کی رومانیت نے شاعری کو آگے بڑھایا اسی زمانے میں تسنیم اور کوثر میں امی کا کلام چھپنا شروع ہوا۔

پھر بہاولنگر کی نہر ہو یا قلات کے پہاڑوں پر چڑھنا، حسنِ فطرت سے محبت اور سیر و سیاحت کا یہ سلسلہ اللہ نے شادی کے بعد بھی جاری رکھا۔ میرے بچپن کی اولین یادوں میں لارنس گارڈن جانا، وہاں کی پہاڑیوں پر چڑھنا، دوڑ لگانا، درختوں اور پرندوں کے ناموں اور قسموں پر گفتگو ہونا، پھولوں کے رنگ و بو پر اللہ کی تسبیح پڑھنا، خالق و مالک کی تخلیق اس کے لاشریک ہونے اور قرآن مجید میں ارشاد باری تعالیٰ کے مطابق زمین میں گھومنے پھرنے اور غور و فکر کرنے کا ذکر ہوتا۔

امی کے گھومنے پھرنے، تاریخی جگہوں سے دلچسپی اور نئے دور کی نئی نئی چیزوں سے سیکھنے کے شوق کو دیکھتے ہوئے ابا جی امی کو 1969ء میں یورپ کی سیر کو لے کر گئے اٹلی، فرانس، انگلینڈ، جینوا اور لبنان سے واپسی پر امی ابا جی نے اپنا پہلا عمرہ ادا کیا ابا جی کے دنیا سے جانے کے بعد بھی اللہ نے امی کو جگہ جگہ کی سیر کرائی، حج اور عمروں کی سعادت بھی نصیب ہوئی جس میں ہمیشہ ابا جی کے ساتھ کیے جانے والے عمرے

کہ میری بڑی بہن زہرا امی سے زیادہ ملتی ہے کیونکہ اس میں امی جیسا ٹھہراؤ، پڑھنے کا شوق اور ادب سے لگاؤ تھا۔ اگرچہ ہم بھی گھر کے ماحول اور امی، ابو کی تربیت و ترغیب کی وجہ سے مطالعہ کے شوقین تھے مگر امی جیسے نہیں کہ اگر جھاڑو دیتے ہوئے بھی کوئی کاغذ کا ٹکڑا مل گیا تو پہلے اس کو پڑھیں گے پھر صفائی مکمل ہوگی۔

میں نہایت شوخ، کھلنڈری، فنونِ لطیفہ، حسنِ فطرت کی دیوانی اور سیاحت کی دلدادہ تھی۔ جب لوگ زہرا کو امی کی طرح کہتے تو میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوتی کہ لوگ مجھے بھی امی جیسا کہیں اور ایک روز جب میں نے اپنے دل کی بات امی سے کہی تو انہوں نے مجھے گلے لگایا اور بولیں تم تو بالکل میری طرح ہو! اوریوں وہ اپنے ماضی میں جا پہنچیں: بچپن میں پاکھڑ کے سوکھے پتوں پر چلنا میرا پسندیدہ کام تھا، پتوں کی چرچراہٹ مجھے بہت بھلی لگتی تھی (پاکھڑ کا دیو قامت پیڑ امی کے بریلی والے محل نما گھر میں پھاٹک سے داخل ہو کر بڑے احاطے میں لگا ہوا تھا جسے امی اپنی آخری عمر تک یاد کرتیں رہیں)

باغ میں جا کے درختوں پے چڑھنا، پتوں پر لوٹنا، پھل توڑ کر کھانا، چڑیا بن کر گھونسلے میں بیٹھنے کا کھیل کھیلنا امی کا بچپن تھا۔ اسی لئے پرندوں کی چھچھاہٹ، پتوں کی چرچراہٹ، ستاروں کی جگمگاہٹ، شفق کی مسکراہٹ، جھرنوں کی گنگناہٹ، ہواؤں کی سرسراہٹ سے لطف اندوز ہونا امی کی طبیعت کا جزو لا ینفک تھا اور امی کے اندر کا یہ حساس مصور حسنِ فطرت کی پرستاری کرتے ہوئے امی کی شاعری میں نئے

کا ذکر ضرور کرتیں۔ اباجی کے بعد امی گھومتی پھرتیں، اللہ کا
ذکر اور شکر بھی ادا کرتیں، ہماری خوشی کی خاطر تمام چیزوں
میں شامل بھی ہوتیں مگر ادھورے دل کے ساتھ:

شہر دل آہ عجب شہر تھا، پر اس کے گئے

ایسا اجڑا کہ کسی طرح بسایا نہ گیا

جہاں میری یہ خواہش ہے کہ میں امی کی تمام حسنت کی
اچھی وارث بنوں وہیں مجھے یہ خوشی بھی ہے کہ میں امی کی ہمہ
جہت شخصیت کے ایک خوشگوار اور دلچسپ پہلو کی عکاس ہوں

تیرے نقشِ قدم پہ میں بھی چلوں

میرے دل میں یہ کتنا ارماں ہے



لَوْ لَوُ الْمَكْنُونِ

وقت میں پڑھتی ہوں۔ لہذا میرے لئے نماز میں ٹال مٹول کرنا یا دیر لگانا، گناہ کبیرہ کے زمرے میں آتا ہے مینا باجی آہستہ آہستہ بچوں سے کہتیں کہ نماز پڑھ لو جبکہ میں دھمکاتی رہتی کہ یا درکھو، دس سال کے بچے کو نماز نہ پڑھنے پر خود رسول اللہ نے مارنے کا حکم دیا ہے۔

کبھی ان سے بچوں کی شکایت کی جاتی تو کہتیں تمہارے بچے بڑے اچھے ہیں میں نے دیکھے ہیں کہ بچے کیسے کیسے ہوتے ہیں تم شکر کیا کرو۔

اگر میں کبھی بچوں کو ڈانٹتی تو ان کا چہرہ اتر جاتا۔ اس وقت تو کچھ نہ کہتیں بعد میں کہتیں کہ بچوں کو نہ ڈانٹا کرو، مجھے تکلیف ہوتی ہے۔ کہتیں کہ بچہ بھی پورا آدمی ہوتا ہے۔ اس کے احساسات، جذبات اور عزت نفس کا خیال رکھنا چاہیے۔

مینا باجی کی ہمیشہ یہی کوشش ہوتی کہ میری ذات سے کسی دوسرے کو زحمت نہ ہو۔ کبھی وضو کر کے نکلیں اور اطلاع ملی کہ کھانا لگ گیا ہے، تو فوراً کھانے کیلئے آ جاتیں کہ دوسروں کو انتظار نہ کرنا پڑے۔ اگر میں کسی معاملے میں پوچھتی کہ اس طرح کر لیں یا اس طرح، تو ہمیشہ یہی کہتیں کہ جیسے تمہیں سہولت ہو، کبھی اپنی رائے مسلط نہیں کرتی تھیں۔

رسول اللہ سے پوچھا گیا کہ یا رسول اللہ، کونسا اسلام افضل ہے؟ آپ نے فرمایا کہ (اس شخص کا اسلام) جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان محفوظ ہوں (بخاری)

مینا باجی اس حدیث مبارکہ پر پورا اترتی تھیں۔ اپنی ساری زندگی میں انہوں نے حتی الوسع کسی شخص کی شعور دل آزاری نہیں کی عزیز واقارب ہوں یا ملنے جلنے والے، ہر کسی کو اچھے الفاظ میں یاد کرتیں۔ ہمیشہ خندہ پیشانی سے ملتیں۔ بہت اچھی سامع تھیں۔ پوری توجہ اور دلچسپی سے بات سنئیں اور اپنے تئیں بہترین مشوہ دیتیں جس کا لب لباب یہی ہوتا کہ دوسروں کے قصوروں سے صرف نظر کیا جائے، خوش گمانی رکھی جائے اور نرمی سے کام لیا جائے۔ اگر ان کو کسی کی کوئی ناروا بات بتائی جاتی تو کہتیں کہ ہو سکتا ہے اس کا مطلب یہ نہ ہو۔ ہو سکتا ہے کوئی اور وجہ ہو، کوئی غلط فہمی ہو گئی ہو۔ ہمیشہ بات کا مثبت پہلو سامنے رکھتیں۔

میں اور وہ دو مختلف مسالک سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ سراپا نرمی، درگزر، مفاہمت پسند اور میرا یہ عالم کہ جب صحیح بات یا اصول کی بات یہ ہے تو پھر ایسا ہی ہونا چاہیے۔

بچوں کی نماز پر اکثر گھر میں شور ہنگامہ ہوتا۔ میرے متعلق میرے سر اللہ بخشے، کہا کرتے تھے کہ یہ تو وقت سے پہلے نماز پڑھ لیتی ہے۔ میں احتجاج کرتی کہ اباجی، اول

ہر حال میں خوش رہنے کی کوشش کرتیں اور ہمہ وقت اللہ کا شکر ادا کرتی رہتیں کہ مجھ ذرّۂ ناچیز کو اس نے بہت نوازا ہے میں اپنی ملنے جلنے والیوں سے کہتی کہ میں اپنی ساس کا زیادہ ذکر اس لئے نہیں کرتی کہ کہیں نظر نہ لگ جائے۔

بچوں کی سرگرمیوں میں دلچسپی لیتیں۔ ان کے ساتھ لڈو وغیرہ کھیلتیں ساتھ بڑی دلچسپ کمٹری کرتی جاتیں جس سے بچے بہت خوش ہوتے۔ ریان اپنی گاڑیاں لے کر ان کے بستر پر چڑھ جاتا۔ پھر ان گاڑیوں کے قافلے بنتے، مقابلے ہوتے، حادثے ہوتے۔

لڑکے اکثر کھیلنے کے لئے نیچے بھاگ جاتے اور فارعہ دادی اماں کا سر کھاتی رہتی کہ آج اسکول میں یہ ہوا، فلاں لڑکی نے یہ کہا، مس نے یوں کہا۔ خاموش ہنستی رہتیں، پھر اسے سمجھاتیں کہ تمہیں اس طرح کرنا چاہیے تھا۔ فلاں لڑکی کو دوست نہ بناؤ اس میں فلاں عادت اچھی نہیں ہے۔ فارعہ کے ساتھ گڑیوں کے گھر بناتیں، اُن کے کپڑے سی کر دیتیں چائے کی شوقین تھیں جو بھی انہیں چائے پلاتا اُسے خوب دعائیں دیتیں۔ فارعہ بھی اس شوق میں ان کے ساتھ شامل تھی مجھ سے چھپ چھپ کر دن میں کئی دفعہ چائے بناتی اور پھر دونوں دادی پوتی چائے کی دعوت اڑاتیں۔

رشتہ داری نبھانا دنیا کا مشکل ترین کام ہے، لیکن اسے بھی خوش اسلوبی سے کر گزرتیں۔ ہر ایک کے خوشی اور غم میں شریک ہوتیں اپنے بچوں کو بھی تاکید کرتی رہتیں کہ صلہ رحمی کیا کرو بیٹے سے پوچھتی رہتی فلاں کو فون کیا، فلاں سے بات ہوئی، فلاں سے ملنے گئے۔ زیادہ تر رشتہ دار کراچی میں

رہتے تھے۔ جب بھی کراچی آتیں، ان کی کوشش ہوتی کہ سب سے یاکم از کم فون پر رابطے میں رہیں۔

اکثر ذکر کرتیں کہ تمہاری امی اور خالاؤں کے ساتھ تو ہمارے شادیوں سے بھی پہلے کے تعلقات ہیں وہ دن یاد کرتیں جب وہ سعیدہ قطب مرحومہ کے ساتھ پہلی دفعہ فصیح منزل آئیں۔ اگرچہ اب ان کی یادداشت کم ہو گئی تھی لیکن ماضی کے تمام واقعات اور شخصیات ان کے ذہن کے پردے پر اُسی طرح نقش تھے آپا حمیدہ بیگم، آپا زبیدہ بلوچ، آپا ام زبیرہ، آپا نیر بانو، بی بی خالہ (بنت الاسلام) ان سب کا ذکر بہت محبت اور عقیدت سے کرتیں۔ ان کے واقعات سناتیں آہستہ آہستہ جب یہ سب دل عزیز ایک ایک کر کے اس جہان فانی سے عالم جاودانی کی طرف جا رہی تھیں، تو ان پر اس کا بڑا اثر تھا۔ ان کے نام لیتے ہی آنکھوں میں آنسو آ جاتے۔

سلمیٰ باجی، نیر بانو نمبر، کیلئے مینا باجی کے تاثرات چاہتی تھیں ان دنوں وہ عارفہ کے پاس کوئٹہ میں تھیں۔ سلمیٰ باجی نے کہا کہ وہاں کا نمبر دے دو لیکن میں نے یہی کہا کہ اگر آپ نے اُن سے بات کی تو شدت جذبات سے اسی وقت ان کی طبیعت خراب ہونے لگی گی۔ آخر طے یہ پایا کہ وہ جب اسلام آباد آئیں گی تو مل کر بیٹھیں گے اور ہلکی پھلکی باتوں کے دوران مطلب کی بات کی جائے گی۔ شومئی قسمت وہ کوئٹہ سے فیصل آباد چلی گئیں اور اس پروگرام پر عمل نہ ہو سکا۔

بی بی خالہ، امی، عفت خالہ بلکہ میری تمام خالاؤں،

بہنوں اور کزنوں سے انہیں بہت محبت تھی۔ عارفہ ممانی اور ان کی بہنوں سے بھی برسوں پرانے تعلقات تھے۔ جب کسی کا ذکر کریں تو چہرے پر ایسی محبت کی روشنی پھیل جاتی جیسے ان کے اپنے ہی تو ہیں اور بے شک انہی کے تھے کہ جو رشتہ ان کے درمیان تھا، دین کا رشتہ، وہ خون کے رشتوں سے زیادہ مستحکم ہوتا ہے۔

آپا، باجی، سامی اور شمر کا تفصیل سے حال پوچھتیں۔ کون کہاں ہے؟ کیا کر رہا ہے؟ بچے کتنے ہیں؟ کن جماعتوں میں پڑھ رہے ہیں امی کی وفات کا انہیں بہت صدمہ تھا جب ذکر آتا، آواز بھرا جاتی، میرے پاس جب ہوتیں تو سمجھتیں کہ یہ اسلامیہ پارک ہے بی بی خالہ اور امی کی وجہ سے اہل اسلامیہ پارک ان کی محبتوں میں شامل تھے۔ وہ انہیں اپنا ہی خاندان سمجھتیں کراچی میں کچھ عرصہ ابو میرے ساتھ رہے تو ان کو بڑی تسلی تھی۔ کہتی تھیں کہ سر پر کسی بزرگ کا ہونا خوش نصیبی ہے جب ہم حج پر گئے تو فارم پر ورثاء کا نام اور پتہ تحریر کرنا تھا تا کہ کسی حادثے کی صورت میں اطلاع دی جاسکے ہم تینوں کے فارم پر ابو کا نام درج تھا۔

شعر و شاعری کا خوب ذوق تھا لیکن کبھی سنجیدگی سے اپنا کلام چھپوانے کا نہیں سوچا۔ شاعری میں بڑے خوبصورت الفاظ استعمال کرتیں تھیں بتاتی تھیں کہ میں نے بڑی چھوٹی عمر میں کتابیں پڑھنا شروع کر دی تھیں جب مجھے ان کی سمجھ بھی نہیں آتی تھی۔ مجھے کہتیں کہ میری خواہش تھی کہ میری بہو لکھنے پڑھنے والی ہو بے شک اسے کھانا پکانا نہ آتا ہو۔ ہمیشہ تلقین کرتیں کہ اپنی مصروفیات میں سے وقت نکال کر لکھو۔

انسان سوچتا ہے کہ فارغ ہو کر یہ کام کروں گا۔ لیکن فراغت کبھی نصیب نہیں ہوتی وقت ملتا نہیں، نکالنا پڑتا ہے۔ پھر ہر عمر کا اپنا تجربہ ہوتا ہے۔ میں جب کچھ لکھتی اور انہیں سناتی تو اس طرح خوش ہوتیں جیسے خود لکھا ہو۔

طویل عرصہ تک مدیرہ نور رہیں بچوں کے لئے چھوٹی بحر میں بڑی پیاری پیاری نظمیں کہیں۔ بچوں سے انہیں بہت محبت تھی چاہے اپنے ہوں یا کسی ملنے والے کے۔ ان سے باتیں کرتیں، ان کے مشاغل پوچھتیں حالانکہ ہمارے ہاں عموماً بچوں کو لفٹ نہیں کرائی جاتی بلکہ یہی کہا جاتا ہے کہ جاؤ جا کر آپس میں کھیلو، ہمیں باتیں کرنے دو۔ لیکن وہ سمجھتیں تھیں کہ بچوں سے مکالمہ کرنا چاہیے کیونکہ بچے اپنے بڑوں ہی سے ادب آداب اور تہذیب سیکھتے ہیں۔ اپنے پوتے پوتیوں کو اسے نواسیوں کو اپنے دور کی باتیں سناتیں اور ان کو وہ تہذیبی ورثہ منتقل کرنے کی کوشش کرتیں جو برصغیر کی مسلم ثقافت کا خاصہ تھا۔

پچھلے ایک سال سے وہ کافی کمزور ہو گئی تھیں۔ یوں تو اباجی کی وفات کے بعد ہی سے ان کی دنیا سے دلچسپی ختم ہو گئی تھی۔ ایک طویل خوشگوار، بھرپور اور آسیدیل زندگی کے بعد اب تو وہ گویا صرف وقت گزار رہی تھیں۔ گو کہ وہ اپنے بچوں کی خوشیوں میں شریک رہتیں لیکن دل کی ہر اُمنگ تو جیسے ابا جی کے ساتھ ہی چلی گئی تھی۔ اب اکثر و بیشتر یہ شعر پڑھتی رہتیں۔

ہوش و حواس و تاب و تواں جا چکے ہیں داغ
اب ہم بھی جانے والے ہیں سامان تو گیا

اور لمبوں پر یہی دعا تھی کہ اللہ نماز پڑھاتا اور روزے رکھواتا لے جائے۔ اللہ نے ان کی دعا قبول کی۔ عشاء کی نماز پڑھ کر خود اپنے قدموں سے چل کر ہسپتال گئیں اور فجر سے پہلے تہجد کے بابرکت اوقات میں اُس رحمان و رحیم مالک کے حضور پہنچ گئیں جو کہتا ہے کہ

”جو لوگ کہ اللہ نے جن جن روابط کو برقرار رکھنے کا حکم دیا ہے، انہیں برقرار رکھتے ہیں، اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور اس بات کا خوف رکھتے ہیں کہ کہیں ان سے بُری طرح حساب نہ لیا جائے اور جو اپنے رب کی رضا کے لئے صبر سے کام لیتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، ہمارے دیئے ہوئے رزق میں سے اعلانیہ اور پوشیدہ خرچ کرتے ہیں اور برائی کو بھلائی سے دفع کرتے ہیں، آخرت کا گھرا نہی لوگوں کے لئے ہے۔ (الرعد ۲۱-۲۲)



میرا پیغام محبت ہے

یوں کسی تحریکی جلسے کی دعوت کے پیغام کا نقشہ کھینچا جارہا ہوتا۔ تو کبھی ہم نوری محفل سجائے لطیفے اور کہانیاں سنا کر محظوظ ہو رہے ہوتے اور اگر مومن سون کا موسم ہوتا تو وہ ہمیں نہر کے کنارے اور پارکوں میں لے جایا کرتیں، جہاں سب ملکر جھولا جھولنے اور دوڑیں لگانے کے مقابلے کیا کرتے۔ لڑکپن کی حدود سے ابھی قدم آگے بڑھائے ہی تھے کہ پتہ چلا کہ پھپھو وداع ہو کر اپنی سسرال (لاہور) میں جا بسیں۔ حسن اتفاق سے پھوپھا جان بھی کوئی کم دلچسپ شخصیت نہ تھے۔ انتہائی خوش مزاج، مہمان نواز اور محبت کرنے والے تھے کہ ہمیں ان کے ساتھ کبھی کوئی اجنبیت نہ لگی۔ لاہور جانا ہوتا تو پھپھو کے پاس رہنا ہماری دلی آرزو ہوتی۔ اس دوران ہم نے دیکھا کہ ان کے گھر (سسرال) میں ہر طرح کے سسرالی رشتے موجود تھے، پھپھو ان سب کے درمیان کس خوش اسلوبی کے ساتھ رہ رہی تھیں، بڑا خاندان بھاری کام اور حساس رشتے نبھانا کوئی آسان نہیں ہوتا۔ لاہور کے سخت ترین موسم میں ہم نے انہیں کھانا پکانے سے لے کر کپڑے دھونے صفائی اور رسلائی سب ہی کام کرتے دیکھا۔ مجال ہے جو کبھی ماتھے پر شکن آئی ہو۔ وہ کام کرتی جاتیں اور ہم سے دنیا بھر کے موضوعات پر تبصرے اور تجزیے ہوتے جاتے۔ ہم دیکھتے کہ وہ کام بہت

شعور کی دنیا میں جب آنکھ کھولی تو میں نے اپنے ارد گرد جن مشفق ہستیوں کو پایا ان میں سے ایک میری پھپھو تھیں..... بہت مجتبیٰ مینا! اس وقت اگرچہ وہ خود بھی کم عمر ہی تھیں لیکن اپنی صالح فطرت متوازن شخصیت کی وجہ سے گھر کے تمام افراد میں یکساں ہر دل عزیز تھیں۔ میرے لئے یہ بات بڑی باعث خیر تھی کہ مجھے بسم اللہ پھپھو نے پڑھائی۔ کہتے ہیں کہ تعلیم و تربیت پر اس شخصیت کے گہرے اثرات ہوتے ہیں جو یہ ابتدائی کلمات کہلاتا ہے اور اس کی دعا بارگاہ رب میں قبولیت کا درجہ پاتی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ ابتدائے زندگی سے دھوپ ڈھلنے تک ان کا وجود سایہ کی طرح میرے ساتھ ساتھ رہا اور میں یہ فیصلہ نہیں کر پاتی کہ وہ میری استاد تھیں، بہن یا دوست..... عجیب بات ہے کہ پھپھو کو میں نے اپنی عمر کے ہر حصے میں اپنا ہم عمر پایا۔ جب بچپن تھا تو ان کے ساتھ کھیلتے کودتے کونڈے، مستونگ (کونڈے) کے پہاڑوں پر ان کے ہمراہ چڑھتے اور اترتے۔ جہاں وہ ہم بہن بھائیوں کے ناموں سے نظمیں کہہ رہی ہوتیں۔

ٹوٹی حمیرا واصف والنیر بنے ہیں
 بابر میاں ہلالی پرچم لئے کھڑے ہیں
 کاغذ کے بھونپوؤں سے اعلان ہو رہا ہے

آہستہ آہستہ کیا کرتیں لیکن انتہائی سلیقہ اور نفاست سے یوں انہیں مسلسل کاموں میں مصروف دیکھ کر ایک دن ہم نے مشورہ دیا کہ بس اب جلدی جلدی کام نمٹایا کریں تاکہ فرصت ملے پھپھو نے مسکراتے ہوئے کہا، بیٹا کیا تم چاہتی ہو کہ پھپھو جلدی مرجائیں ہم نے متعجب نظروں سے سہم کر دیکھا جس پر انہوں نے اپنے انداز سے بتایا کہ جو لوگ تیز یا جلدی جلدی کام کرتے ہیں وہ ذہنی دباؤ کا شکار ہو جایا کرتے ہیں اسی لئے جلدی مر بھی سکتے ہیں اور پھر ہم نے دل ہی دل میں پھپھو کے اطمینان بھرے انداز میں کام کرنے پر شکر کیا۔ ساتھ ہی تصور میں ان تمام لوگوں سے ہمدردی ہونے لگی جن کو جلدی جلدی کام کرنے کی عادت تھی، اکثر رات کے کھانے سے فراغت کے بعد اپنے بڑے بھائیوں کے ساتھ ان کی خوب عالمانہ بحثیں ہوا کرتیں۔ ملکی و بین الاقوامی حالات پر گفت و شنید ہوتی۔ ایران و عراق جنگ کے تذکرے ہوتے، امت مسلمہ کا مستقبل اور جماعت اسلامی کی تیاریوں کے حوالے سے تبادلہ خیال ہوتا۔ اور ہم حیرانی سے دیکھتے کہ وہ پھپھو جو دن میں ہمارے ساتھ ہماری دلچسپی سے متعلق خوش گپیاں کیا کرتیں ان میں اتنی ساری معلومات کہاں سے آگئیں وہ میرے والد اور چچاؤں کے ساتھ دانشورانہ گفتگو میں برابر کی شریک ہوتیں۔ دینی اور سیاسی پہلو سے ہمارے گھر میں بڑے ہی پایہ کی مدبر شخصیات تھیں اور پھپھو بھی ان میں سے ایک تھیں جو زبان کی غازی نہیں بلکہ کردار کی بھی غازی تھیں۔ جماعت اسلامی خواتین لاہور میں متحرک کارکن تھیں۔ جہاں ہر مرحلہ میں تحریک کے شانہ بشانہ رہیں، آپا حمیدہ کی رفاقت سے سفر

شروع کیا تو آخر دم تک جماعت کا ساتھ نہ چھوڑا۔ تحریکی سرگرمیوں کے ساتھ ادبی دنیا میں بھی خوب نام کمایا۔ ان کے خوبصورت اشعار اخبارات و رسائل کی زینت تو تھے ہی ہماری گھر کی محفلوں میں بھی رونق بخشتے تاروں بھرے آسمان کے نیچے شعر و شاعری ہوتی اور پھوپھا جان کی سریلی آواز میں ہم سب بڑے شوق و ذوق سے اردو و فارسی کی نظمیں اور غزلیں سنا کرتے نئی دانم چہ منزل شب جائے کہ من بودم۔ آج بھی ان کی مسحور کن آواز کانوں میں رس گھول دیتی ہے۔ شادی بیاہ کی تقریبات میں تو ان ادبی مجلسوں کا رنگ اور بھی دوبالا ہو جایا کرتا یادوں کے الہم میں ان گنت سہانی شامیں ہیں جن کا تذکرہ الفاظ میں ممکن نہیں۔

دینداری کے اعلیٰ مرتبہ پر ہوتے ہوئے ان کے مزاج میں نہ سختی تھی نہ رہبانیت، تربیت کرنے کا بھی ان کا ایک الگ ہی انداز تھا۔ انہوں نے کبھی کسی چیز سے حکماً نہ کبھی روکا نہ کرنے پر اصرار کیا۔ وہ معاملہ کے دونوں پہلو سامنے رکھ دیا کرتیں۔ بلکہ اکثر خاندانی روایات اور اپنے بزرگوں کے واقعات ان کے طور طریقے سنایا کرتیں اور جب کبھی ہم اپنی نا سمجھی اور غلط پسندی کی وجہ سے ان کی منطق ماننے سے انکار کر دیتے تو وہ یہ کہہ کر خاموش ہو جاتیں کہ ابھی تمہاری عمر کم ہے۔ جب ان تجربات سے گزرو گی سب سمجھ آ جائے گا۔

ان کے مزاج کا خاصہ تھا کہ جس سے ملتیں پوری توجہ اور انہماک سے اس کی باتوں میں دلچسپی لیتیں اور شامل گفتگو

اٹھی تھی اور میں جدھر بھی نظر اٹھاتی ہوں نیک صالح فطرت صحت مند درد رکھنے والی نسل کو موجود پاتی ہوں۔ ان کے بیٹے بیٹیاں ہوں یا بہو اور داماد، بھتیجے بھتیجیاں ہوں یا ان کی اولادیں، اللہ کا صد ہا بار شکر کہ اس نے راہ راست دکھائی، اسی سے استقامت کی دعا ہے، اللہ ان کی خدمات اور تحریکی قربانیوں کو قبول فرمائے خطاؤں سے درگزر کا معاملہ فرمائے اور علیین میں وہ اعلیٰ مقام عطا فرمائے جس کے لئے انہوں نے زندگی بھر جدوجہد کی (آمین)

خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را



ہوتیں۔ ان کی بات چیت میں شگفتگی اور مزاح ہوتا، سب سے بڑھ کر یہ کہ مخاطب کے پسند کے موضوعات پر بات کرنے میں مہارت رکھتی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ جو ان سے ملتا ان کے اخلاق و حیثیت سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہتا۔ ان کی ذات میں ایک خاص کشش تھی جو زندگی کے آخر وقت تک رہی۔

ہم ان سے فیشن سجاوٹ میک اپ اور زیورات پر بھی رائے لیتے اور سسرال اور خاندانی رشتوں کی حساسیت اور الجھنوں پر بھی مشورے کرتے، انہوں نے خود بھی ان رشتوں کے درمیان صبر تحمل اور بردباری سے زندگی گزاری اور دوسروں کو بھی عزت خدمت اور محبت کے سبق دیئے۔ ان کا کہنا تھا کہ محبت میں بڑی طاقت ہے، محبت خود اپنا اثر دکھاتی ہے، اللہ سے دعا کیا کرو کہ وہ محبت دے، پھر کوئی حق جتلانے یا منوانے کی ضرورت نہیں رہتی۔ شاید یہی وہ گر تھا جس نے ان کو ہر مقام پر عزت دی۔ ان کا کہنا تھا کہ اللہ کی صفت عدل سے ڈر لگتا ہے، کہ کب کس کی حق تلفی پر وہ انصاف کے کٹہرے میں کھڑا کر دے کہ وہ تو منصف حقیقی ہے

-

جماعت اسلامی کا سرمایہ اپنے رب سے محبت اور خوف کی کیفیت رکھنے والی عظیم ہستیاں میرے خاندان کا اثاثہ اور تھیں جن میں میرے (والد) ناصر سلطان، پھوپھا عبد السلام (چچی) سعیدہ قطب اور (پھپھو) بنت مجتبیٰ مینا داغ مفارقت دے گئے۔ یہ بات قابل شکر ہے کہ یہ سب جماعت اسلامی کے اہم ستون تھے۔ جماعت کے فکر، تربیت اور اجتماعیت کی برکات سے جو فصل انہوں نے بوئی تھی وہ لہلہا

نیند سی نیند، ہمیں اب نہ اٹھانا لوگو!

ہر روپ میں اُن میں انکسار، تدبر و تحمل اور خود کو دوسروں پر مسلط نہ کرنے کا انداز نمایاں رہا۔ انہوں نے ساس بہو کا روایتی آزمائشی رشتہ بھی اس خوبی سے نبھایا کہ مثال نہیں ملتی۔ مجھے 1990ء کی دہائی کا وہ دن آج بھی یاد ہے جب امی نے مجھے گھر سے بلا کر کہا تھا ”میں نے ذروہ کا رشتہ مانگا ہے اور میں چاہتی ہوں تم اپنی بہن کے لئے استخارہ کرو۔“ میں رات کو نفل اور دعا پڑھ کر سوئی تو خواب میں کیا دیکھتی ہوں کہ مرحومہ خالہ بنت الاسلام ہنستی مسکراتی میری طرف بڑھ رہی ہیں۔ قریب آ کر بولیں ”عُرفی جی! میں کو ”ناں“ نہیں کہنی۔ اگر وہ کہے مہندی لے کر آتی ہے، اُسے پھر بھی ”ناں“ نہیں کہنی (یعنی ہر قیمت پر ”ہاں“ کہنی ہے)“ میں نے یہ خواب امی کے آگے بیان کیا تو وہ آب دیدہ ہو گئیں۔

شادی کے بعد ذروہ میکے آئی تو دُلہا میاں ساتھ تھے۔ خیال تھا کہ حسبِ روایت ایک رات رکیں گے مگر جب تین روز تک دُلہا دلہن کی رخصتی کے آثار نظر نہ آئے تو امی فکر مند ہو گئیں کہ کیا ماجرا ہے؟ ذروہ کو گریڈ نے پر معلوم ہوا کہ میں باجی نے بیٹے کو یہ کہہ کر بھیجا ہے کہ ”میاں! ہم تو جانتے ہیں تم کیسی اولاد ہو اب اپنے سسرال والوں کے ساتھ رہ کر ثابت کرو کہ انہیں کتنا اچھا بیٹا ملا ہے۔“

میں نے حاضرینِ محفل پر ایک نظر ڈالی اور غزل کا مطلع پڑھا

اک رقص میں بل تھا

شاید کہ مرا دل تھا

داد و تحسین کی پہلی آواز صدرِ مجلس کی طرف سے آئی۔ یہ تھیں سب کے لئے معروف شاعرہ بنتِ مجتبیٰ مینا اور میرے لئے ”مینا باجی“ جو حسبِ معمول ہلکے رنگ کا باوقار لباس پہنے حریم ادب کے ماہانہ اجلاس کی صدارت کر رہی تھیں۔ شعور کو کھنگالتی ہوں تو ایک گندم گوں مسکراتا ہوا شفیق چہرہ گرفت میں آتا ہے۔ بال سر کے وسط میں چھوٹے سے جوڑے کی صورت میں سمٹے ہوئے اور لب و لہجے میں شائستگی، مٹھاس اور با محاورہ اردو کی چاشنی۔ گفتگو کا آغاز عموماً یوں کرتیں ”ارے بھئی! بات دراصل یہ ہے کہ.....“ سچ تو یہ ہے کہ وہ حریم ادب کی رونق تھیں۔ ہر کس و ناکس کی حوصلہ افزائی کرتیں اور تحریری کمزوریوں پر تعمیری تنقید کرتیں۔ میرے مجموعہ ”کلام کا پیش لفظ“ تحریر کرتے ہوئے انہوں نے جس عالی ظرفی اور کشادہ دلی کا ثبوت دیا وہ انہی کا حصہ تھا۔

میں نے انہیں تقریباً ہر روپ میں دیکھا یعنی ایک بیوی، ماں، شاعرہ، مدیرہ ”نور“، صدرِ حریم ادب، میری امی (سعیدہ احسن) کی سہیلی اور میری بہن ذروہ احسن کی ساس۔

بھلا بتائیے اس گھٹے ہوئے ہندوؤں کے نقال معاشرے میں، جہاں بیٹا اپنی سسرال کھانے پر رُک جائے تو داویلا مچا دیا جاتا ہے کہ بس گیا ہاتھ سے، ایسی وسیع القسمی کتنے والدین کا حصہ ہے؟

اسی طرح ذروہ ایک سال فرانس میں گزار کر واپس آئی تو چھوٹی بہن شمر کا بی اے کا آخری پرچہ باقی تھا۔ بحالتِ مجبوری فیصلہ ہوا کہ ذروہ انیر پورٹ سے سیدھی سسرال چلی جائے اور اگلے دن میکے آئے۔ ہم سب بہنیں انیر پورٹ پر ہی اُسے مل کر واپس جانے لگیں تو اُس کی نند زہرا نہالہ نے میرے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا ”عرفی باجی! امی نے ہمیں کہہ کر بھیجا ہے کہ ذروہ جب تک اپنی ماں کے گلے لگ کر اُن کا دل ٹھنڈا نہ کر لے، میرے پاس نہ آئے۔“ میرا منہ حیرت سے کھل گیا کہ یا اللہ یہ مینا باجی کس کوہ قاف سے آئی ہیں؟

اُن کی ہفت رنگ شخصیت کا ایک متاثر کن اور پرسوز پہلو شوہر سے دائمی جدائی کے بعد دیکھنے میں آیا۔ سالہا سال لوگوں نے عبدالسلام صاحب کے ذکر پر انہیں جس طرح تصویرِ غم بننے دیکھا وہ ازدواجی وفا شعاری کی کتاب کا روشن باب تھا۔

گزشتہ چند سالوں سے نسیان کا شکار تھیں مگر فطری نیک طبعی دیکھنے کہ اس عالم میں بھی ایک بار کہنے لگیں۔
”میں بہت بھولتی ہوں مگر فائدہ یہ ہے کہ اگر اچھی بات یاد نہیں رہتی تو بُری بات بھی تو بھول جاتی ہے اور دکھ نہیں ہوتا۔“

یادوں کے البم میں سینکڑوں دلکش تصاویر ہیں۔ کہیں میرے بیٹے رافع کی پیدائش پر ست رنگی ساڑھی تحفتاً دے رہی ہیں تو کہیں اسلام آباد سے میری امی کو فون پر کہہ رہی ہیں۔ ”آج میں نے اپنے بیٹے اور بہو کو پہلی بار آزادانہ گھر بار چلاتے دیکھا۔ دو نفل ادا کرتے ہی آپ کو فون کر رہی ہوں۔“

کہیں حریمِ ادب میں اُن کے چھوٹی بھر کے دلکش اشعار ساعتوں کو ترنم ریز کر رہے ہیں تو کہیں ادارہ بتول کی سالانہ میٹنگ میں نہایت تدبر سے مسائل سلجھا رہی ہیں۔
قلم حیران ہے کہ کہاں تک سنو گے، کہاں تک سناؤں۔

مینا باجی! اللہ آپ پر وہ ساری خوشخبریاں پوری کرے جو اُس نے مومنوں سے وعدہ فرمائی ہیں۔

اور رہی میں! تو آج سے چار سال پہلے میری امی کی جدائی پر آپ نے جو اظہارِ غم کیا تھا وہی آج میرے دل کی بھی آواز ہے

آس فردوس میں ملنے کی لیے بیٹھی ہوں
آتشِ غم دلِ مخروں میں لیے بیٹھی ہوں
شدتِ غم سے میں ہونٹوں کو سیے بیٹھی ہوں



محبتوں کے سفیر

خود انہیں دوسروں کی برائی یاد نہیں رہتی تھی اور دوسروں کو ان کی برائی یاد آتی نہیں تھی۔ وہ حقیقتاً انہی مسلمانوں میں سے تھیں کہ جن کے ہاتھ اور زبان سے دوسرے مسلمان محفوظ رہتے ہیں۔

میں جاتی اور اس کے بعد وہیں بیٹھ رہتی۔ مینا باجی سے ادب کے موضوع پر گفتگو چھڑ جاتی اور وقت کا پتا ہی نہ چلتا جہاں ان کے دھیمے لہجے، عمدہ تلفظ اور خوب صورت خیالات کا سحر انسان کو جکڑ لیتا تھا وہیں ان کے ایک بہترین اور متحمل مزاج سامع ہونے کی خاصیت بھی مخاطب کا دل موہ لیتی تھی۔ دوران گفتگو ذرہ کبھی باور پچی خانے میں چلی جاتی اور کبھی کھانے پینے کی چیزیں لے کر ہمارے پاس آ کر بیٹھ جاتی، میں مینا باجی کے محبت بھرے اصرار پر کھاتی رہتی اور باتیں کرتی جاتی کہ واپسی کا بلا وہ آ جاتا اور مجھے یاد آتا کہ میں نے تو ذرہ سے بہت سی باتیں کرنی تھیں۔ واپسی کی جلدی میں آدھی باتیں یاد بھی نہ آتیں اور میں انہیں فون پر کر لینے کا سوچ کر واپس ہو جاتی۔

پچھلے کچھ عرصے میں ان کی یادداشت کمزور ہو گئی تھی۔ وہ بار بار باتیں بھول جاتیں اور دوبارہ پوچھنے لگتیں کہتیں برا مت ماننا، مجھے یاد نہیں رہتا اس لئے دوبارہ پوچھ لیتی ہوں۔ اپنی اس بیماری کو بھی ایسے مثبت انداز میں لیتی تھیں کہ چلو اچھا ہے بھول جاتی ہوں۔ اس طرح کسی کی برائی یاد نہیں رہتی۔ خود انہیں دوسروں کی برائی یاد نہیں رہتی تھی اور دوسروں کو ان کی برائی یاد آتی نہیں تھی۔ وہ حقیقتاً انہی مسلمانوں میں سے تھیں کہ جن کے ہاتھ اور زبان سے دوسرے مسلمان محفوظ رہتے ہیں ایسے حقوق اللہ اور حقوق العباد پورے کرنے والے مسلمانوں کے لئے اللہ کے جو وعدے ہیں وہ انہیں مینا باجی کے لئے پورے فرمائے اور ہمیں بھی ایسی زبان کی حفاظت اور ضبط نفس کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین



مینا باجی کو میں اپنے بچپن سے ہی جانتی تھی۔ وہ امی کی سہیلی تھیں۔ ہم خیال سہیلی مگر ہم مزاج نہیں۔ کیوں کہ امی اپنی بات پر زور اور مضبوط لہجے میں کہنے کی عادی تھیں اور مینا باجی دھیمے لہجے اور تجویز کے انداز میں لیکن دونوں کے درمیان بہت محبت تھی اور یہی محبت ہمارے دلوں میں بھی نفوذ کر گئی تھی اپنی پڑھائی اور ملازمت کی مصروفیات کے باعث میں کبھی بھی حرم ادب کی محفلوں میں شرکت نہ کر سکی اور جب میں نے حرم ادب میں آنا شروع کیا تو مینا باجی ذرہ اور سہیل بھائی کے پاس کراچی جا چکی تھیں۔ چنانچہ میرا ان کا واسطہ دو حوالوں سے ہی رہا۔ ایک تو امی کی سہیلی اور دوسرا بہن کی ساس۔ مگر ان کی اس دوسری حیثیت کے بارے میں مجھے کچھ شک ہی تھا کیونکہ ان میں ایک ساس والے مخصوص آثار کبھی دکھائی نہ دیئے تھے۔ جب اس شبہ کی تصدیق کے لئے میں نے ذرہ سے پوچھا کہ مینا باجی بطور ساس کیسی ہیں؟ تو وہ کہنے لگی پتا نہیں۔ میں نے پوچھا کیوں؟ بولی، دراصل ہم دونوں کے درمیان کبھی ساس بہو والے روایتی تعلقات استوار ہی نہیں ہوئے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ ہم بھی ان سے ملتے اور باتیں کرتے ہوئے کبھی ایسے محتاط نہیں ہوئے تھے جیسا کہ عموماً بہنوں کی سسرالوں میں انسان غیر شعوری طور پر ہی ہو جاتا ہے۔

سہیل بھائی کی ٹرانسفر اسلام آباد ہو گئی۔ میری سسرال بھی چونکہ راولپنڈی میں تھی لہذا جب سسرال جاتی تو ذرہ کے گھر بھی ضرور جاتی اور یوں مینا باجی کے پاس بیٹھنے اور باتیں کرنے کا زیادہ موقع مل جاتا۔ ہوتا یہ کہ وہاں جاتے ہی بچے تو ذرہ کے بچوں کے ساتھ کھیلنے میں لگ جاتے اور میں برقع اتار کر ذرہ سے کہتی میں مینا باجی کو سلام کراؤں تو پھر آرام سے باتیں کرتے ہیں۔ یہ کہہ کر ان کے کمرے

غزل

خدا معلوم کیا گزرے گی اب شاخِ نشین پر
کہو، صیاد کے ہاتھوں چمن والوں کا کیا ہوگا

کھلیں آنکھیں، اٹھے خواب بہاراں دیکھنے والے
خزاں سے پوچھتے ہیں اب گلستانوں کا کیا ہوگا

یہ مانا آپ کو پیارے ہیں نقشِ پائے امریکہ
مگر شمعِ وطن کے پاک پروانوں کا کیا ہوگا

مبارک بت گری ان کو، مبارک آذری ان کو
مگر اے دل ! برا ہی تمناؤں کا کیا ہوگا

بدل جاتے ہیں وہ اپنی کہی سے ہر دفعہ مینا
خدا جانے اب ان کے تازہ فرمانوں کا کیا ہوگا

اگر شاخِ نشین کاٹ دی صیاد نے سچ مچ
مرے دل کا الہی ! میرے ارمانوں کا کیا ہوگا

بیتِ مجتبیٰ مینا

غزل

دلوں میں کچھ ہے زباں پہ کچھ ہے
رقیب سارے ہی خوش گماں ہیں

ہو خیر تیری زمیں کی یا رب
بھٹکے ہوئے سات آسماں ہیں

جوکل تک تھے ہمارے قاتل
وہ آج کیوں ہم پہ مہر باں ہیں

یہ کچھ پری چہرہ لوگ ہم سے
خبر ملی ہے کہ بد گماں ہیں

کہاں کہاں آپ روکے گا
جگہ جگہ ان کے آستاں ہیں

ہزار کوشش کے بعد بھی ہم
نہ مٹ سکیں گے وہ داستاں ہیں

انہیں نہ توڑو یہ زندگی ہیں
جو سادہ سادہ سے آشیاں ہیں

بیتِ مجتبیٰ مینا

غزل

آؤ کہ حسنِ یار کی باتیں کریں بہم
ہے زندگی میں وقت بہت کم بہت ہی کم

آؤ چلیں ذرا کی ذرا کوئے یار تک
آنکھوں میں روشنی ہے بہت کم بہت ہی کم

بدنام کر گیا حرم و دیر میں رقیب
پل بھر بھی اس کی بزم میں بیٹھے نہ تھے کہ ہم

مینا اٹھو کہ بجنے کو ہے صبح کا گجر
یہ وقفہ سفر ہے بہت کم بہت ہی کم

قطعہ

نیم خوا بیدہ کنول جیسے کسی تالاب میں
نکھری نکھری چاندنی میں سورہی ہے کائنات

چپکے چپکے لٹ رہا ہے کاروانِ زندگی
قطرہ قطرہ رِس رہی ہے آہِ صہبائے حیات

بنتِ مجتبیٰ مینا

آرزوئے حضوری

میں ترے نگر میں پہنچوں
ترے در پہ جا کے بیٹھوں
مجھے لاکھ سب اٹھائیں
میں وہاں سے پھر نہ اٹھوں
ترے آستان سے آگے
یہ نظر کبھی نہ جائے
مرے ہونٹ کچھ نہ بولیں
میں کسی طرف نہ دیکھوں

قطعہ

کیا دنیا کا دستور عجب
کیا جگ کی ریت نرالی ہے
جس شاخِ چمن کو سینچا تھا
اس پر ہی نشین بھاری ہے
احوالِ بہاراں سننے کو
بے تاب ہیں دل زندانوں میں
کہتے ہیں کہ گلشن میں ہر سو
ایک ہو کا عالم طاری ہے
ہر زخمِ زمانہ بھرتا ہے
ہر دکھ کا مداوا ہوتا ہے
جو بھر نہ سکے تا عمر کبھی
وہ زخمِ محبت کاری ہے

بنتِ مجتبیٰ مینا

غزلیہ

آج کے دن تری محفل سے پیام آیا تھا
خاک کے ذرے کو سورج کا سلام آیا تھا
آج کے دن کے لئے بزم سچی تھی ساری
دستِ ساقی سے مرے ہاتھ میں جام آیا تھا
میں نے سمجھا تھا مجھے اس نے پکارا ہوگا
اس کے ہونٹوں پہ کسی اور کا نام آیا تھا
آرزو جس کے لئے قافلہٴ عشق چلا
رہِ رُشوق بتا، کیا وہ مقام آیا تھا؟

☆.....☆.....☆

رونقِ کون و مکاں رشتہٴ جاں ہے کوئی
جانِ جاں، جانِ جگر، جانِ جہاں ہے کوئی
کھولے کیسے لبِ شکوہ، بیداد و ستم
ہائے کیا کہیے قریبِ رگِ جاں ہے کوئی
لوگ کہتے ہیں کہ آئینہٴ دل ہیں آنکھیں
سچ بتانا مری آنکھوں سے عیاں ہے کوئی
کون کہتا ہے یہاں کوئی نہیں ہے محبوب
مینا کہیے! کہ یہیں جانِ جہاں ہے کوئی

بنتِ مجتبیٰ مینا

غزل

کتنی چاہت کتنے ارماں
دُفن ہیں اس دیرانے میں

کیسے کیسے ماہِ تاباں
ڈوب گئے پیمانے میں

کتنی آنکھوں کی برساتیں
برس گئیں میخانے میں

دھواں سا اٹھتا ہے رہ رہ کر
کون ہے اس کاشانے میں

غم ہی غم ہے ساری کہانی
دکھ ہی دکھ افسانے میں

تنہا تنہا کیوں بیٹھی ہو
مینا مینا اب میخانے میں

بنتِ مجتبیٰ مینا

چراغ سے چراغ جلتے رہیں

وسط فروری 2011ء کی بات ہے، دبئی سے عینی کا فون آیا تو حسب معمول ہمارے درمیان محبت بھرے گلے شکووں کیتند و تیز جملوں کا تبادلہ ہوا۔ پھر اطلاع ملی ”امی آئی ہوئی ہیں آپ کو یاد فرما رہی ہیں۔“

میرے استفسار پر معلوم ہوا کہ ویزہ صرف ایک ماہ کا لگا ہے، کچھ دنوں بعد چلی جائیں گی۔ میرا قطر جانے کا پروگرام تھا۔ سوچا اس سے پہلے ملاقات کا اہتمام کر لینا چاہیے تو طے پایا کہ عینی جمعہ کی دوپہر کو ہمارے غریب خان پر امی اور میاں، بچیوں کو لے کر آجائیں گی۔

اُس جمعہ کی دوپہر کو میری باجی مینا سے آخری بالمشافہ ملاقات تھی، میں نے اپنی ایک اور سہیلی تسنیم، کو ان کی امی سمیت بلا لیا۔ جن کے ساتھ محبت و شفقت اور احترام کا رشتہ بے پناہ ہے۔ تسنیم کی والدہ (ستارہ واحدی) سے باجی مینا مل کر بے حد خوش ہوئیں اور ان کی قرآن کی خطاطی کو دیکھ کر بہت سراہا۔ تسنیم باجی مینا سے مل کر بہت متاثر ہوئیں بعد میں مجھے کہنے لگیں کہ

”میں نے اس عمر میں اتنی زندہ دل خاتون کبھی نہیں دیکھی۔“

کھانا تو باجی مینا نے برائے نام کھایا مگر خوش دلی سے تعریف بہت کی۔ یہی ان کی خاص خوبی تھی۔ دوسروں کی

صلاحیت کو، تھوڑے تعاون کو بہت گردانتی تھیں۔

3 مئی 2011ء کو خالہ جان ثریا اسماء کے ساتھ ہمارے گھر ایک نشست کا اہتمام تھا۔ میں بہت خوش تھی کہ میری دلی خواہش پوری ہوئی کچھ بہنوں کے ساتھ لکھنے لکھانے کا پروگرام ترتیب پا رہا تھا وہ بھی خالہ جان کی موجودگی میں۔ اسی نشست میں خالہ جان نے بتایا کہ باجی مینا آئی ہوئی ہیں ان کو بھی بلوا لیتے مجھے حیرت اس بات پہ تھی کہ وہ تو چلی گئی تھیں، شاید نہ گئی ہوں۔ مگر معلوم ہوا کہ دوبارہ آئی ہیں۔ ان سے رابطہ کرنے کی کوشش کی مگر نہ ہو سکا۔ ویسے بھی اتنے کم وقت میں ان کا آنا محال تھا..... بعد میں عینی کو فون کیا تو معلوم ہوا کہ زیادہ مدت کا ویزہ لگ گیا ہے دوبارہ جلدی آگئی تھیں اب کچھ عرصہ رہیں گی۔ عذرا بہن کے ساتھ یہ پروگرام طے کیا کہ ہم باجی کے ساتھ ایک پارٹی کا اہتمام کر لیں گے۔ اچھا ہے ہماری دوسری نشست بھی ایک ادبی شخصیت کے ساتھ ہو جائے گی۔

فون پہ باجی مینا سے میری بات منگل کو ہوئی۔ میں نے ملاقات کرنے کا پروگرام بتایا تو کہنے لگیں۔

”آپ سب لوگ میرے پاس آ جاؤ نا! ہاں ان خاتون کو بھی لانا جن کی خطاطی تم نے مجھے دکھائی تھی“ میں نے طبیعت کے بارے میں پوچھا تو کہنے لگیں۔

”بس بیٹا! اللہ تعالیٰ ایمان کے ساتھ بلا لے۔ انتظار میں بیٹھے ہیں کب بلا داتا ہے؟“ اور پھر حسبِ عادت تہقہہ لگایا جیسے بلاوے کی آواز کہیں قریب ہی ہو۔ جمعرات کی صبح کو عذرا بہن کے ساتھ یہ طے پایا کہ ہم جون کے پہلے ہفتہ میں کسی دن باجی مینا کے ساتھ مل بیٹھیں گے۔ ابھی اس بات کو چند گھنٹے بھی نہ گزرے تھے کہ ہاجرہ بیٹی کا فون آیا۔

”خالہ! میں ہاجرہ بول رہی ہوں۔ آج صبح نانو کا انتقال ہو گیا ہے۔“

انا للہ وانا الیہ راجعون۔ انسان اپنے پروگرام بناتا ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ کے اپنے پروگرام ہوتے ہیں اور اسی کے منصوبے نافذ ہو کر رہتے ہیں۔

علم وادب، جانفشانی، خلوص وایثار کا ایک باب ختم ہو گیا۔ ایک شخصیت کی کہانی کا پہلا حصہ ختم ہوا..... دوسرا حصہ، دوسری زندگی شروع ہو گئی۔ ایک زندگی سے دوسری زندگی میں داخلہ ہو گیا۔ ایک دنیا سے دوسری دنیا میں منتقل ہو گئیں پیچھے یادیں اور نیکیاں جو صدقہ جاریہ بنیں گی، رہ گئیں، پیچھے رہ جانے والوں کے پاس ان کی محبت و شفقت رہ گئی..... اب ہمارے پاس ایک ہی چیز رہ گئی جو ان کے کام آسکتی ہے، دعائے مغفرت..... اور ان کی خوبیوں کی ترویج!

ماں کے دنیا سے پہلے جانے کا غم کتنا گہرا ہوتا ہے اس کا مجھے بخوبی اندازہ ہے۔ امت السلام یعنی سے ملنے کی تڑپ اس قدر شدید تھی کہ بس نہ چل رہا تھا کہ وہاں پہنچ جاؤں۔ واصف بیٹے کو فون کیا، وہ اور رانیہ آئے تو ہم یعنی کے گھر پہنچے..... گھر میں سناٹا ایسا تھا کہ دل کو وحشت ہونے لگی..... ایک

ہستی دنیا سے رخصت ہو گئی اور اس کا جسدِ خاکی ہسپتال میں ہے۔ ان کے جانے کی رخصت ہونے سے پہلے کی کیفیات بیٹی کے لئے بتانا کس قدر مشکل کام ہے اس کا بھی مجھے تجربہ تھا..... اللہ تعالیٰ کا کس قدر احسان ہے کہ اُس نے ہمیں شعور دیا زندگی اور موت کا، اور صبر کے اجر کا حوصلہ دیا۔ اسی شعور اور حوصلے کی ردا اوڑھے یعنی نے ہمیں بتایا۔

”آخری وقت پورے ہوش و حواس میں کلمہ طیبہ زبان پر جاری تھا۔ ایسولینس سے اتارتے ہوئے، جب لڑکے نے عادتاً لا الہ الا اللہ“ کہا تو اُسے کہنے لگیں کہ ”محمد رسول اللہ“ بھی کہو..... کچھ وقت آئی سی یو میں گزرا اور پھر روح پروانہ کر گئی اس رب کی طرف جو اس کا مالک رفاقت ہے..... انا للہ وانا الیہ راجعون۔“

عرب امارات میں میت کو گھر نہیں لاسکتے۔ ہسپتال سے سرکاری اہتمام کے تحت آخری رسومات کے لئے قبرستان سے ملحق جنازہ گاہ میں لے جایا جاتا ہے۔ غسل، کفن و دفن کا سارا انتظام حکومت کے تحت ہوتا ہے۔ یہاں میت کو غسل دینے والے پیشہ ور افراد نہیں ہوتے، اچھے خاندان بلکہ اشرافیہ کی خواتین و مرد رضا کارانہ یہ خدمت انجام دیتے ہیں۔ پھر پور شفقت، خلوص اور خاص کر مسنون دعاؤں اور مسنون طریقہ کے ساتھ غسل دیا جاتا ہے۔ قریبی رشتہ دار بھی ان کے ساتھ شامل ہوتے ہیں۔

ہفتہ کی شام چار بجے ہم دوہی، اپنی پیاری مینا باجی کی رخصتی کے لئے جمع ہوئے۔ دلہن کی رخصتی کی تیاری کی جارہی تھی اور میں اپنے بارے میں سوچ رہی تھی۔ کبھی یہی وقت

میرے پر بھی آنے والا ہے۔ جانے وہ وقت کتنا قریب ہے۔
دوسروں کے ہاتھوں تیار ہونے نئے کپڑے پہن کر رخصت
ہونے کے لئے..... مجھے اپنے لکھے ہوئے کچھ الفاظ یاد آنے
لگے۔

جب مجھے ”دلہن“ بنایا جائے گا

کورے لٹھے کا عروسی جوڑا

خوشبوؤں میں بسا کر

پہنایا جائے گا

وقتِ رخصتی روتی آنکھیں، اداس چہرے

لب پہ دعائیں ہوگی

دلوں میں جدائی، جدائی کی صدائیں ہوگی

پاس بیٹھی بہنوں سے کچھ باتوں، کچھ اپنی سوچوں میں
گم تھی کہ دلہن کی رخصتی کا سہم آگیا..... نماز جنازہ ادا ہو چکی
تھی..... سامنے سیدھی سڑک پہ جنازہ کا جلوس جا رہا تھا۔ ہم
جنازہ گاہ کی عمارت سے باہر کھڑے حقیقی منزل کی طرف لے
جاتے ہوئے جلوس کو دیکھ رہے تھے۔ لب پہ دعائیں اور روتی
آنکھیں، اداس چہرے..... دل جدائی، جدائی کی صداؤں
سے لبریز تھے۔

کوئی نہیں جانتا کس کو کس مقام پر موت آئے گی یہ کتنی
بڑی حقیقت ہے۔ انسان اپنے پاؤں چل کر اس مقام تک
پہنچتا ہے جہاں اس کا ٹھکانہ مقدر میں لکھ دیا گیا ہوتا ہے۔

دور سے وہ جگہ نظر آرہی تھی۔ قبرستان میں خواتین نہ گئی
تھیں۔ مگر یہ دور سے نظر آرہا تھا کہ اپنے گھر کو روانہ ہونے
والی پہنچ گئی ہے۔ اُس دن کا سورج بھی غروب ہونے کے

قریب تھا اور بیٹیوں کے دل کا سورج بھی غروب ہو چکا تھا۔
مجھے اپنی فکرستانے لگی۔ اُس دو گز کے گھر کا تصور میرے
سامنے تھا۔

بعد رخصتی دو گز کا میرا ”اپنا گھر“ ہوگا

”اپنے گھر“ میں سب کچھ ”میرا اپنا“ ہوگا

اس گھر میں زندگی کا نیا باب

ساتھ لایا ہوا قول و عمل کا سب اسباب

کھولا جائے گا

اسباب کی وضاحتوں میں

کچھ نہ بولا جائے گا۔

سب پہ گریہ طاری تھا..... یقیناً سب کو اپنے جانے
والے بھی اور اپنا جانا بھی یاد آ رہا ہوگا۔ مرد حضرات قبرستان
سے واپس آنا شروع ہو گئے تھے۔ میں نے بھی واپسی کی
اجازت مانگی۔ ہاجرہ بیٹی کہنے لگی ”آپ کا شکریہ“ آپ آئیں
جزاک اللہ۔“

”میں تو اپنے لئے آئی ہوں بیٹا۔“ میں نے مری مری
سی آواز میں کہا تو عارفہ نے ہاجرہ کو مخاطب کر کے کہا۔

”ارے! تم نہیں جانتی ان سے امی کی محبت کو..... یہ تو

امی کے بہت قریب ہیں بہت عرصہ سے“ اور یہ اتنی بڑی
مسیحائی ہے جس کی گواہی ”نور“ کا رشتہ ہے۔ نور رسالہ بھی اور
نور کا رشتہ روشنی والا بھی۔ بچپن میں جب پڑھنا سیکھا تو ”نور“
ہی ہمارا ساتھی تھا اور باجی مینا ہماری دوست، کافی عرصہ تو ہم
بچے باجی مینا کو اپنے جیسی بچی ہی سمجھتے رہے۔ بس کچھ تھوڑا
بڑی ہوں گی ہم سے..... پھر ممانی رشیدہ سے معلوم ہوا کہ وہ تو

ہماری امیوں جیسی ہیں لیکن ذہن میں تصور وہی رہا۔ ممانی
 رشیدہ سے ان کے بارے میں باتیں سن کر بہت مزہ آتا تھا۔
 دونوں میں قربت داری تھی۔ مجھے نہیں معلوم میری ان سے
 ملاقات پہلی بار کب اور کہاں ہوئی۔ غالباً جمعیت کے
 پروگراموں میں ہی ہوئی ہوگی..... دس سال کی عمر سے ”نور“
 میں لکھنا شروع کیا۔ میرا قلمی تعارف تو ان کے ساتھ اسی عمر
 سے تھا ہی..... جب بھی ملیں کچھ نہ کچھ سکھایا ضرور.....
 جمعیت کے پروگراموں میں ان کی بیٹی امت السلام سے دوستی
 ہوئی پھر زہرا نہالہ سے بھابھی کا رشتہ بنا۔ لیکن ان کے ساتھ
 جو دلی تعلق تھا وہ ان سب رشتوں سے جدا اور مضبوط ہمارے
 گھر جب کھانے پہ تشریف لائی تھیں تو میں نے تسنیم واحدی
 سے تعارف کروایا۔

”یہ میری دوست بھی ہیں استاد بھی اور مرشد بھی“

تو زور سے ہنسی اور کہنے لگیں ”لو اور سنو! مرشد بھی بنا لیا
 پاکِ داماں کی حکایت سنو ان سے“

”تو آپ انکار کرتی ہیں کیا؟“ میں نے ان کو گاؤن
 اتارنے میں مدد دیتے ہوئے پوچھا تو کہنے لگیں ”بیٹا! سب
 اُس کا کرم ہے کہ دلوں میں محبت ڈال دیتا ہے“ اور پھر قہقہہ
 لگایا..... ”اور محبت کیا کیا گل نہیں کھلاتی ہے۔“

وہ جب بھی دوہی آئیں ہم عینی کے گھر یا ہمارے گھر
 کھانے پر ضرور جمع ہوئے اور خود میرا تعارف کراتے ہوئے
 جو تعریف و تحسین میں کہا کرتی تھیں وہ نادم کرنے کو کافی ہوتا
 تھا..... عینی کی گولیگ مسز اطہر بھی موجود تھیں ایک مرتبہ
 کھانے پر، عینی کے گھر..... ان کو میرا تعارف کراتے ہوئے

پاکِ داماں کی حکایت کو اتنا دراز کیا کہ انہوں نے اپنے سکول
 کے سالانہ فنکشن میں مجھے مہمان خصوصی کے طور پر بلا لیا
 اور اس میں امت السلام بھی ”قصور وار“ تھی۔

تقید، اعتراضات، غلطیوں کی وہ میں رہنے کی بجائے
 شاباش، حوصلے اور تحسین کے انداز سے بزرگ اپنے بچوں کو
 زیادہ موثر انداز میں صلاحیتوں کے اظہار کا موقع فراہم کر
 سکتے ہیں..... اچھائی کم بھی ہو اس کو جا کر کر کے برائی کا پہلو
 کم کیا جاسکتا ہے..... جہاں بھی موقع ہو سکتا تھا بچوں سے
 گفتگو کرتیں۔ ان کے ماضی الضمیر کو ابھارنے کے لئے
 سوال کرتیں اس طرح گویا وہ خود کچھ نہیں کانتیں، بچوں کو
 آفاقی نظر سے دیکھنے، سوچنے اور سمجھنے کی ہمت دلاتیں میں
 نے لاہور رہائش کے زمانہ میں ان سے کافی ملاقاتیں کیں،
 بچوں کو ان سے ملوایا۔ جب بھی اپنے گھر ان کو آنے کی
 دعوت دی تو انکار نہ کیا۔ اصرار کر کے اپنے گھر بھی
 بلواتیں اور ہم نسبت روڈ پر ان سے ملنے جاتے..... ایک بار
 مجھے بلوایا کہ آؤ دیکھو، اندرون شہر میں چھتوں سے بسنت کا
 سماں کیسا ہوتا ہے۔ میں نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔
 ”آپ مجھے اس لئے بلوا رہی ہیں؟“ تو کہنے لگیں ”زندگی
 میں کبھی اس منظر کو دکھانا پڑے تو حقیقت کی نظر سے لکھو گی
 نا!“

جب ہم اتفاق ٹاؤن سے ان کے گھر روانہ ہوئے تو
 سخت آندھی آگئی..... سائیکل پہ تھے۔ ان کے گھر پہنچے تو ہم
 دونوں میاں بیوی دھول سے اٹے ہوئے تھے..... تو بہت
 محظوظ ہوئیں

”دیکھو، ایک یہ تجربہ بھی ہو گیا تمہیں“

ان کو ہر چیز ہر نظر، ہر بات کسی اور تناظر میں سمجھانے کا فن آتا تھا۔ تحریکی پروگراموں، حریم ادب کے اجلاسوں میں ان کا ساتھ ہمیشہ ایک مثبت تاثر کو نمایاں کرتا محسوس ہوتا تھا۔ اپنی بیماری کا تذکرہ نہ کرتیں بلکہ پوچھنے پر بھی ہنس کر ٹال دیتیں۔ اپنے حصے کی ذمہ داریوں کو ادبی ہوں، تحریک یا معاشرتی احسن طریقے سے نبھایا۔ ان کے گھر کی سیڑھیاں بہت مشکل تھیں۔ میں ہمیشہ حیران ہوتی اور ان کی ہمت کی داد دیتی کہ وہ کیسے ان سے اتر، چڑھ کر آتی، جاتی ہیں۔ میں تو ہانپنے لگتی تھی۔ ان سے پوچھتی تو ہنسنے لگتیں۔

جب ہم ملتان شفٹ ہوئے تو اپنی چھوٹی بیٹی عارفہ ہمایوں کے پاس آئی ہوئی تھیں۔ حریم ادب کی نشست ہمارے گھر پہ منعقد ہوئی۔ ان کی گفتگو کا انداز بہت الگ سا ہوتا اور شریک مجلس خواتین مدتوں یاد رکھتی تھیں۔ اُس دن کمال مہربان سے میرے پاس رات تک ٹھہریں، کھانے کی میز پر بچوں سے سر حاصل گفتگو کی۔ تاریخ اسلام، تاریخ عالم، پاکستان غرض ہر موضوع پر بچوں سے سوالات کئے۔ نویرہ بیٹی کہنے لگیں ”ان کے سوالوں سے مجھے بہت سی باتوں کے بارے میں جستجو کی طلب پیدا ہوئی۔“

جب میں رات کو انہیں واپس عارفہ کے گھر چھوڑنے جا رہی تھی تو آپا بنت الاسلام کو یاد کرنے لگیں۔ ان کی بہت سی باتیں بتائیں اور کہنے لگیں ”جانے والوں کی خوبیوں کو یاد کرنے سے ان کے ساتھ محبت کا تعلق ٹوٹتا نہیں ہے۔“ مجھے کہنے لگیں ”تم نے ”نور“ میں اتنی کہانیاں لکھی ہیں

۔ ان کو کتابی شکل میں چھپوا لو۔“

”اس کا تعارف آپ لکھ دیں گی؟“ میں نے شرارتاً پوچھا تو کہنے لگیں ”کیوں نہیں؟ آخر وہ میرے ہاتھ سے ہو کر چھپنے کو دی گئی تھیں۔“

”تو پھر ٹھیک ہے۔ آپ جب لکھ دیں گی تو میں چھپوا لوں گی۔“ بات آئی گئی ہو گئی۔

ایک دن عارفہ کا فون آیا۔

”باجی! امی نے آپ کی کتاب کے لئے کچھ لکھنے کو کہا تھا نا! وہ تو بھول گئی تھیں۔ کراچی سہیل بھائی کے پاس جا کر یاد آیا تو مجھے انہوں نے املا کر دیا ہے۔ اب آپ اس امانت کو وصول کر لیں۔“ کیسے؟“ میں نے حیرت سے ڈوبی آواز میں پوچھا۔

”میں آپ کو املا کر دیتی ہوں نا!“

”چلو، لکھوا دو.....“ میں نے املا کرنا شروع کی۔ عارفہ بولتی جا رہی تھی۔

”عارفہ یہ کچھ زیادہ تعریفیں نہیں ہو گئیں“ میں نے کہا تو عارفہ ہنسنے لگی۔

”باجی! امی تو کہہ رہی تھیں جو کچھ تم اپنے مرضی سے ڈالنا چاہو وہ بھی اجازت ہے۔“ بھی آخر آپ امی کے چہیتے لکھاریوں میں شامل ہیں۔“ میری بات کے جواب میں عارفہ کی آواز آئی۔

میں نے ان کے الفاظ اپنے پاس محفوظ کر لئے، کہ میرے لئے یہ سرمایہ افتخار ہیں۔ مگر ان کی محبت کی فراوانی کے سامنے میری کم مائیگی نادم ہی رہی۔

جانے والوں کی محبتوں کو سلام، ان کی نیکیوں کو اللہ کرے ملے دو وام۔ مغفرت کی دعائیں ان کے لئے صبح و شام۔

کے لئے ہمارے لئے آسانیاں فراہم کرے۔ ان کے لئے دعائے مغفرت کا تحفہ ارسال کرنے میں ہمیں کوتاہی میں مبتلا نہ کرے..... نیکی کے چراغ سے چراغ جلتے رہیں۔ آمین



ہفتہ 21 مئی شام کے وقت جب سورج ڈھل رہا تھا ہم دور سے ان کی آخری آرام گاہ کو دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ شہر خموشاں میں ایک باسی اور جالبسنے کو تیار تھا۔

میں اندر ہی اندر لرز رہی تھی، سب کے ساتھ اس انتقال مکانی کا مرحلہ آنا ہے۔ نہ جانے سفر آخرت کس نے کیسے اور کہاں اختیار کرنا ہے۔

اے مرے رب کریم و رحیم
تیری ساری رحمتوں کا واسطہ
تیرے نبی کی ساری شفقتوں کا واسطہ
زندگی کا نیا باب
قول و عمل کا سب اسباب
کھانے سے پہلے
ان وحشتوں کا سامنا کرنے سے پہلے
”دلہن کی رخصتی“ سے پہلے
کوئی ہنر، کوئی موقع دے دے
اپنے گھر میں ”اسباب“ سجانے کا
سلیقہ دے دے!

واپسی پر گاڑی میں بیٹھی دل ہی دل میں دعا کرتی رہی کہ اللہ رب العزت جانے والوں کی زندگیوں کو ہمارے لئے، ہماری اولادوں کے لئے، روشنی اور خوشبو فراہم کرنے کا ذریعہ بنائے رکھے۔ ان کی نیکیوں کو جاری و ساری رکھنے

زندگی بیت گئی آبلہ پائی نہ گئی!

ہوئے! وہ جس قدر پُرسوز لہجے میں میں ٹھہر ٹھہر کر اپنی شاعری سناتی تھیں، یوں لگتا تھا جیسے ہر لفظ بہت خاص ہے اور بہت اونچا..... اور بہت ڈوب کر لکھا گیا ہے اور جس کے گہرے مطالب مجھ جیسی کم عقل کے فہم سے بالاتر ہیں۔

حریم میں نئے آنے والوں کی بہت حوصلہ افزائی کرتیں۔ بچپن کی ایک یاد بہت تازہ ہے، جب اسما مودودی صاحبہ کے ہاں حریم کی محفل ہوا کرتی تھی۔ ایک نئی خاتون آئیں اور اپنے بالکل بے وزن اشعار کو اس قدر سلیقے سے پڑھنا شروع کیا کہ مینا خالہ کو باوجود منجھی ہوئی شاعرہ ہونے کے، بالکل حقیقت کا پتہ نہ چل سکا اور انہوں نے لکھنے والی سے ان کی غزل بتول کے لئے مانگ لی۔ میں حیرت زدہ سی ہو گئی مگر چھوٹا منہ بڑی بات، کچھ کہہ نہ سکی۔ آپاجی بنت الاسلام پاس ہی بیٹھی ہوئی تھیں اور ان کے چہرے پر زیر لب شرارتی سی مسکراہٹ تھی۔ وہ مینا خالہ کا گھٹنا دبا کر آہستہ سے کہنے لگیں ”مینا! شاعری بالکل بے وزن ہے“ مینا خالہ نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا اور خاموش ہو گئیں، دوبارہ ان صاحبہ سے غزل نہ مانگی۔

بنتِ مجتبیٰ مینا کی سرپرستی حریم ادب میں کتنے ہی آنے والوں کے لئے اس محفل کے وقار اور معیار کی علامت تھی۔ جب نئے آنے والے اپنی ٹوٹی پھوٹی کاوشوں پر اتنی توجہ کی

محترمہ بنتِ مجتبیٰ مینا..... شائستگی، وقار اور رکھ رکھاؤ کا ایک ایسا نمونہ، جن کی شخصیت میں ایک پوری تہذیب رچی بسی تھی۔ انہیں دیکھ کر تخیل میں وہ پورا رہن سہن جاگ اٹھتا تھا، جسے ہم نے برصغیر کے مسلمانوں کی اعلیٰ تہذیب و تمدن کے حوالے سے کتابوں میں پڑھا ہے۔

وہ ان شخصیات میں شامل ہیں، جن کے چہرے اور آواز سے واقفیت کا آغاز میرے بے حد بچپن سے ہوتا ہے اور ان معنوں میں وہ میرے ناسٹجیا کا حصہ بن گئی تھیں۔ اس بات کا احساس مجھے اس وقت ہوا جب گزشتہ سال ادارہ بتول کی میٹنگ میں ان سے برس ہا برس بعد ملاقات ہوئی۔ ان کا شاداب چہرہ ذرا کمبلا گیا تھا مگر ان کی آواز، ان کی مسکراہٹ، ان کے لہجے کا زیر و بم وہی تھا..... بالکل وہی..... جس سے میں شاید آنکھیں کھولتے ہی آشنا ہو گئی تھی۔ پھر بڑے ہوتے ہوتے میں نے ان کو ذمہ داریوں کے ہر روپ میں دیکھا۔ ادارہ بتول کے اجلاسوں میں معاملات سلجھاتے ہوئے، حلقہ خواتین کے تین روزہ تربیتی اجتماعات میں رات کو دیر تک جاگ کر کام کرتے اور رپورٹیں بناتے ہوئے، حریم ادب میں نو آموز قلم کاروں کی تحریروں پر کبھی خاموش مسکراتے ہوئے اور کبھی تبصرہ دیتے ہوئے۔ مگر ان سب سے الگ مجھے ان کا ایک روپ لگتا تھا..... اپنے شعر سناتے

نظر دیکھتے تو ان کا حوصلہ کتنا بڑھ جاتا تھا، یہ کسی ایسے لکھاری سے پوچھیے جس نے اپنی پہلی تحریر ان کے سامنے پڑھی ہو۔ مجھے یاد ہے کہ نور کے لئے نظمیں لکھتے لکھتے میں نے اچانک ایک دن جب آزاد نظم کہی جو نہیب کا کاخیل مرحومہ کے لئے تھی، تو آپا جی بنت الاسلام اور مینا خالہ کے چہرے کیسے چمک اٹھے تھے اور مجھے لگا تھا جیسے آج میں نے کوئی بہت ہی بڑا اور انوکھا کام کیا ہے۔ یہ خواتین پتھروں میں سے پارس تلاش کرنے کا کٹھن کام کرتی تھیں۔ خود ہشت پہلو ہی راہو کر..... معیار، لیاقت اور ہنر کی علامت ہو کر..... ٹیڑھے میڑھے، بد نما، اونگے بونگے پتھروں سے سر پھوڑنا کس قدر کٹھن کام ہے، اس کا تو اندازہ کرنا بھی ہر کسی کے لئے ممکن نہیں ہے۔ اپنا ہیروں موتیوں جیسا وقت اور دماغ کسی پارس کو تلاشنے، کسی پتھر کو تراشنے میں صرف کرنا..... بغیر نتیجے کی ضمانت کے..... صرف خدا سے اجر کی تمنا میں..... ایسی مثالیں کہاں ملیں گی! سالوں کی محنت کئی بار سالوں کے بعد پھل دیتی ہے اور کئی بار سالوں بعد بھی نہیں دیتی۔ انسان ایک امید کے سہارے لگا رہتا ہے۔ پتھر کو جو تک لگانے کا یہ کام بڑے دل گردے کا کام ہے اور مینا خالہ نے یہ کام سالہا سال کیا..... بحیثیت مدیرہ نور بھی اور بحیثیت نگران لاہور حریم ادب بھی۔ اور اب چند حروف ان کی شاعری پر..... علامہ اقبال نے کہا ہے

رنگ ہو یا خشت و سنگ، چنگ ہو یا حرف و
صوت
معجزہ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود

اور کسی معاصر شاعر نے فن شاعری پر یوں تبصرہ کیا ہے

کہ ایک بات بتانی ہے اور چھپانی ہے!
انا اظہار کی اجازت نہیں دیتی اور اندر کا دباؤ مزید
چپ رہنے سے باغی ہو جاتا ہے۔ دونوں کی مفاہمت جس
نکتے پر آکر ٹھہرتی ہے وہ شعر کہلاتا ہے۔

وہ کیا کیمیا ہے جس کے تحت انسانی شعور و لاشعور، عقل
و جذبات اور خواہشات کی نادیدہ لہریں، گڈمڈ ہو کر پھر خاص
انداز سے ترتیب پا کر شعر و نغمہ کی صورت میں ڈھل جاتی ہیں
، شاید انسانی علم اس کا احاطہ کبھی نہ کر سکے۔ سادہ لفظوں میں
یہ تو بس ایک مترنم دریچہ ہے جو اندر کا حس بڑھ جانے پر خود
بخود کھل جاتا ہے اور مقفل ہو جائے تو جان کنی کی کیفیت میں
بتلا کر دیتا ہے۔ جس کا یہ پیاناہ خطرے کی اس سرخ لکیر تک
بڑھتا بھی انہی کے اندر ہے، جن میں خالق نے حساسیت
کے Sensors دو چار زیادہ ہی رکھ دیے ہوتے ہیں۔ گویا یہ
دریچہ فطرت کے خود مدافعتی نظام کا حصہ ہے جو انسان کو جیسے
چلے جانے کا بہانہ دے دیتا ہے۔

ہر منجھے ہوئے شاعر کی طرح بنت مجتبیٰ مینا کی شاعری
بھی اندرون کی اسی کشمکش کا اظہار ہے۔ عملی زندگی میں
انتہائی صابر و شاکر، وضع دار اور باوقار ہو کر جب وہ شعر کہتی
ہیں تو اظہار یوں ہوتا ہے۔

زندگی بیت گئی آبلہ پائی نہ گئی
اشک بر سائے بہت زخم کو دھونے کیلئے
کوہکن نام ہوا، صاحبِ تیشہ ٹھہرے

ہم کو تقدیر نے پتھر دیئے ڈھونے کیلئے
دشت ہی دشت رہا سامنے اپنے مینا
سایہ گل نہ ملا بیٹھ کے رونے کے لئے

شعر کہنا شخصیت کا ایک لطیف پہلو ہے، خواہ شخصیت کیسی بھی ہو! مگر یہ بھی مشاہدہ ہے کہ شعر کہنے والے عموماً آئیڈیل اور حقیقت میں بہت زیادہ تناقض آسانی سے ہضم نہیں کر سکتے۔ یہ خصوصیت جہاں ان کو ایک انتہائی نامطمئن زندگی کی طرف لے جاسکتی ہے، وہیں اس قابل بھی بنا سکتی ہے کہ وہ اپنی شخصیت کو ایک آئیڈیل شخصیت کے خاکے سے قریب تر کرنے کی کامیاب کوشش کریں۔ شاعر کا لفظ شعور سے نکلا ہے اور اسی لئے علامہ اقبال نے شاعر کو دیدہ بینائے قوم کہا ہے۔ بہت مجتبیٰ مینا کو میں شاعر برادری کے اس کمیاب گروہ میں شمار کرتی ہوں جنہوں نے اس شعور کو محض اظہار ذات تک ہی محدود نہ رکھا، بلکہ اپنی شخصیت کو سنوارنے میں اس سے بہت مدد لی اور اس کی وجہ یقیناً ان کی گہری دینی بنیاد بھی ہے جس نے شخصیت کے ارتقاء کی سمت کو درست رکھا۔ میں مثال کے طور پر ان کی نظم ”مکتب عشق و محبت کا یہ دستور نہیں“ کا ذکر کروں گی (اس شمارے میں موجود ہے) جس میں وہ دنیاوی نعمتوں پر تعلق کی قدر دانی کو ترجیح دیتی ہیں۔ یوں وہ اپنی جمالیاتی حس کو، جو ایک شاعر میں بدرجہ اتم موجود ہوتی ہے، چھوٹی چھوٹی آسائشوں کی سطحیت سے بہت، بلند کر کے، اعلیٰ انسانی قدروں کی خوبصورتی میں ڈھال دیتی ہیں یہ ان کے پختہ شعور کی خوبصورت مثال ہے۔

ان کی زندگی کو دیکھنے والے جانتے ہیں کہ وہ اپنے اس

دعویٰ کا عملی ثبوت بھی خود ہی تھیں۔ ورنہ قدرت بیان اور لفظوں کی صناعی کا ہنر رکھنے والوں کے لئے بڑی بڑی باتیں کرنا، اعلیٰ خیالات پیش کر دینا کچھ مشکل نہیں اسی لئے قرآن نے شعرا کے بارے میں کہا ہے کہ یہ جو کہتے ہیں وہ کرتے نہیں، صرف اہل ایمان اس سے مستثنیٰ ہیں۔ گویا مینا اس استثنیٰ کی لاج رکھتی ہوئی نظر آتی ہیں۔

ہر شاعر کی شاعری میں اس کے دور کے یا گزرے ہوئے بڑے شعرا کا رنگ جھلکنا ایک بالکل فطری امر ہے۔ یہ اور بات ہے کہ کئی رنگوں کو آزمانے کے بعد برس برس کی مشق سے ہر اچھے شاعر کا اپنا ایک انداز بن جاتا ہے جو اسے دوسروں سے ممتاز کرتا ہے بہت مجتبیٰ مینا کی شاعری بھی مختلف ادوار میں مختلف شعرا کے اسلوب کا اثر قبول کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ ان کی ایک نظم جس کا عنوان بھی اقبال کے مصرع پر ہے ”عشق بلا خیز کا قافلہ سخت جاں“ اقبال کے رنگ میں رنگی ہوئی نظر آتی ہے۔ نظم ”ابھی ابھی کی بات ہے“ پر حفیظ جالندھری کی ”ابھی تو میں جوان ہوں“ کی چھاپ محسوس ہوتی ہے۔ تیسری نظم ”ہائے یہ رات“ کے عنوان سے ہے جس کے معانی و اسلوب فیض کی ”مجھ سے پہلی سی محبت.....“ سے مشابہ ہیں یہ اور بات کہ ان کی فکر جدا گانہ ہے۔ مینا صاحبہ کی معروف و مقبول نظم ”میں عورت ہوں.....“ میں نعیم صدیقی کا لہجہ بولتا ہے۔

ان کی غزل مجھے نظم سے زیادہ مضبوط محسوس ہوئی یہاں تک کہ ان کی نظموں میں بھی رنگ تغزل نمایاں ہے۔ غزل کا مشرب تسلیم کا مشرب ہے اور یہ ان کی طبیعت سے زیادہ میل

کھاتا تھا ٹکراؤ کی نسبت مصالحت، انا کی نسبت انکسار، ضد کی بجائے جھکاؤ ان کے مزاج کا حصہ تھا۔ اسی لئے ان کی شاعری رنگِ تغزل سے سچی ہوئی ہے۔ دیکھئے چند شعر

مجھ پہ عیتاب سہی ان پہ عنایات سہی
آپ فرمائیں تو میری شکایات سہی
کچھ

کچھ نہ ہونے پہ بھی کر مک شب تاب
ہوں سہی
مجھ کو پینے سے غرض ساغر مہتاب سہی
اپنی قسمت کا لکھا دیدہ بے خواب سہی
کچھ تو مجھ کو بھی ملا اک دل بے تاب
سہی

یہ المیہ ہے کہ بنتِ مجتبیٰ مینا کا مجموعہ کلام ان کی زندگی میں مرتب اور شائع نہ ہو سکا۔ یہ ان کی روایتی بے نیازی تو تھی ہی مگر میری ناچیز رائے میں نظمِ جماعت یا ادارہ بتول کو از خود یہ اہتمام کرنا چاہیے تھا۔ ان کی زندگی اور صلاحیتیں تو وقف تھیں، مگر جس اجتماعی نظام کے اندر انہوں نے اپنی ذات، اپنی انفرادیت اپنی صلاحیتیں، سب کھپا دیں، ضم کر دیں، بقول منصورہ احمد:

میں تری ذات سے باہر بھی تری ذات
میں
کاش دکھلا دے مجھے میرے کنارے کوئی!

اس نے پلٹ کر اتنا بھی نہ پوچھا کہ لاؤ اپنے منتشر
اوراق ہمیں دو، اپنی راتوں کی بے خوابیاں، اپنے سحر و شام کا

سارا کرب، اپنے حساس دل کی ہر واردات، شیشہ جاں پر پڑنے والی سب لکیروں کی داستاں..... ہم تمہارے مقروض ہیں اور یہ قرض ادا کریں گے، مانا کہ ایک صالح اجتماعیت فرد کی اپنی ضرورت ہے، مگر اس اجتماعیت کی صالحیت پر بھی حرف آتا ہے، اگر وہ اپنے مخلص افراد کا حق نہ پہچان سکے۔ انہی کے دو شعر ان کی نذر کرتی ہوں۔

وادی عشق کا دستور یہی ہے کہ یہاں
تختہ دار پہ تکمیل وفا ہوتی ہے
کیا ستم ہے کہ تری بزم میں اے حسن
تمام
تیرے ہی چاہنے والوں پہ جفا ہوتی
ہے



اب ترا جدا ہونا

چلو پھر ڈھونڈ لائیں ہم، اسی معصوم بچپن کو، انھی معصوم خوشیوں کو، انھی رنگین لمحوں کو، جہاں غم کا پتہ نہ تھا، جہاں دکھ کی سمجھ نہ تھی، جہاں بس مسکراہٹ تھی!!

کل من علیہا فان وبیت فی وجہ ربک ذوالجلال سے حد درجہ ذہنی ہم آہنگی تھی ان کی وفات پر انھوں نے جو اشعار کہے وہ اکثر پڑھتے بھی رہے تھے وہ انھوں نے

اپنے نام کی بجائے میرے نام سے نور میں بھیجے جن میں سے ایک دوا ب بھی ذہن میں ہیں۔ یادش بخیر یہ بات ۱۹۷۴ء تا ۱۹۷۵ء کی ہے۔

کے نیچے سو گئیں۔

کیسے تھے اچھے نانا کیسے تھے

پیارے نانا

جنت میں ان کو یارب اچھا ملے

ٹھکانہ

ان ڈھیروں اشعار میں سے شاعری کے وزن پر پورا اترنے والے رسالے کے لیے رکھ کر باقی مدیرہ نور نے ”قائدہ رابعہ“ کے نام واپس بھجوا دیے۔ قائدہ رابعہ کے فرشتوں کو بھی علم نہیں تھا کہ یہ اشعار اس کے نام سے چھپنے کے لیے بھیجے گئے ہیں..... اشعار تو بعد میں شائع ہوئے البتہ مدیرہ کا خط پہلے موصول ہو گیا۔ دو چار سطری خط تھا جس میں شکریہ ادا کر کے باقی اشعار واپس کرنے کی اطلاع تھی۔

مانو جیسے اس وقت کی قائدہ رابعہ کے پاؤں زمین پر نہیں

بلاشبہ زندہ رہنے والی، ابدی ذات صرف اور صرف میرے رب کریم کی ہے اول و آخر فنا، ظاہر و باطن فنا..... میری پیاری مینا پھوپھو بھی فنا نیت کی چادر اوڑھ کر منوں مٹی کے نیچے سو گئیں۔

آپ سب کی مینا باجی یا مینا آ یا میری مینا پھوپھو کیسے بن گئیں؟ یہ ایک لمبی داستان ہے قصہ مختصر یہ کہ اماں ابا دونوں کی طرف سے شوق ایک ہی ملا تھا..... پڑھنے اور بس پڑھتے ہی چلے جانے کا..... شاید گائے بھینس کی جگالی کی طرح مجھے یہ پڑھنے کی چاٹ بہت بچپن ہی میں لگ گئی تھی..... پہلے پہل مجھے نور پھر بتول، اردو ڈائجسٹ، قومی ڈائجسٹ، سیارہ، جیسے رنگ برنگے رسالے ڈھیروں کے حساب سے آتے اور میرے ہاتھوں میں پہنچ جاتے..... پڑھتے پڑھتے ایک دن کیا دیکھا کہ بچوں کے رسالے نور میں ”قائدہ رابعہ، جہانیاں“ کے نام سے چند اشعار جگمگا رہے ہیں..... یہ اشعار میرے ابا جی (مرحوم و مغفور) نے اپنے سر اور ماموں یعنی

نک رہے تھے۔ ارے مدیرہ نور کا خط اور میرے نام.....
اس کی یقین دہانی کے لیے دل کہاں سے لاؤں!!
پھر جب وہ اشعار شائع ہوئے تو اپنا نام پہلی دفعہ چھپنے
کا 'مزرہ' دنیا کی سب لذتوں سے بڑھ کر لگا..... اور میرے
دل میں مدیرہ کی جگہ بن گئی وہ دور جب بچیاں بڑی ہو رہی
ہوتی ہیں نہ وہ تین میں اور نہ تیرہ میں شمار ہوتی ہیں..... اس
وقت میں نے ایک چھوٹی سی تحریر "نماز کے آداب" کے نام
سے لکھ بھیجی۔ وہ بھی شائع ہوئی ساتھ ہی شکریے کا خط
بھی.....

اس دفعہ کے خط نے تو دل کے ساتھ دماغ پر بھی ان کی
محبت کا جادو بھر دیا..... میری خیالی جنت میں مدیرہ نور ایک
بے انتہا محنتی خاتون تھیں جو ہر ایک کو شکریے کا خط لکھتی ہیں
..... پھر دو تین سال درمیان میں سے کھسکے اور ۱۹۸۱ء میں
میٹرک کے امتحانات کے بعد لاہور گئی۔ یقیناً جمعیت کا
پروگرام تھا لیکن کسی نہ کسی طور بنت مجتبیٰ مینا سے ملاقات ہو
گئی۔

ارے یہ تو بہت ہی ملکہ سی لگتی ہیں۔ بے اختیار دل نے
گواہی دی۔ گفتگو میں حلاوت، لہجے میں مٹھاس، چہرے پر
وقار، گویا ہر لحاظ سے اس خاکے میں بہت خوبصورت رنگ بھر
گیا جو ان دیکھے میں نے ان کا بنایا تھا۔

۱۹۸۱ء میں لکھنے لکھانے کا کام بھی بہت برق رفتاری
سے جاری تھا۔ چھپنے کی غرض سے کہانیاں، اشعار، لطیفے،
تبصرے بھیجتی رہی ادھر سے اچھے اچھے خط آتے رہے۔ ان
خطوط کی زبان بول کر اظہار کرتی کہ یہ انسان دوستی کی تمام

صفات سے متصف ہیں..... وہ دور جب بچوں کو بچہ سمجھ کر ہر
کوئی مسکرا کر ان کی باتوں کو ٹال دیتا ہے..... انھوں نے تو
اس وقت بھی اتنا ادب احترام دیا اور جب بچپن، لڑکپن کی
درمیانی عمر یا میں تھی تب بھی انھوں نے رہنمائی کا فریضہ سر
انجام دیا..... ان کی بہت سی اچھی اور دلکش باتیں اپنی چچی
رشیدہ قطب سے سنتی تھی تو ان کے ساتھ کچھ وقت گزارنے کا
شوق، جنون کی شکل اختیار کر جاتا..... ایسے میں پھر لاہور جانا
ہوا..... اپنی مامی سمیعہ فاطمہ کے ساتھ ۵۶ نسبت روڈ پر چلی
گئی۔

ان سے ملاقات ہوئی گویا دبستان کھل گیا۔ مامی تو مجھے
میری خواہش پر ایک دن اور رات کے لیے چھوڑ کر سنت نگر
واپس چلی گئیں لیکن گھر کی تیسری منزل پر ان کے ساتھ
گزاری رات اکثر چھم سے میرے خیالوں میں اب بھی
آ جاتی ہے۔

میری چھوٹی چھوٹی بلکہ بے مقصد اور بے سروپا باتوں پر
اتنے انہماک سے سننے کا مظاہرہ میں نے پہلی دفعہ دیکھا.....
ان کی بہت خوبصورت عادت تھی کہ وہ بہت نرمی کے ساتھ
تربیت کا کوئی نہ کوئی پہلو سامنے لے آتیں..... شعبہ نشرو
اشاعت کیا ہوتا ہے، جانے میری بلا، لیکن خطوط، مراسلوں کی
ذمہ داری جمعیت نے میرے سر پر ڈالی..... کھٹ سے خط لکھا
جاتا..... اور جھٹ پٹ ہی ایڈیٹرز کو فون بھی کھڑکا دیے جاتے
۔ ایسے ہی مشرق کے ضیاء الاسلام انصاری صاحب کو اس
وقت کے کسی ہاٹ ایشو پر فون کیا اور خوش خوشی انھیں بتایا.....
بہت نرمی سے میرے قمیص کی بائیں بازو پر ہاتھ پھیرتے

ہوئے کہنے لگیں..... نہیں بھی یہ بات تو مناسب نہیں..... پھر بہت نرم نرم لفظوں میں انھوں نے بتایا کہ اس عمر میں کسی غیر محرم کو فون کرنا اور اس کا اشتہار بنانا قابل فخر بات نہیں..... بچیوں کو بہت دھیان رکھنا پڑتا ہے..... یہ وہ دور تھا جب ہر بات اپنی ہی صحیح لگتی ہے لیکن بہت محبت کے ساتھ انھوں نے معلمانہ فرائض جاری رکھے..... پھر تو جب بھی لاہور جانا ہوتا ضرور ان کے ہاں حاضری دی جاتی..... ان کے چہرے پر مجھے بے حد وقار اور تمکنت محسوس ہوتی..... ہر کام کو بہت نفاست اور سلیقہ سے کرنے کی عادی تھیں..... اتنی ”پکی شاعرہ“ تھیں کہ ایک دفعہ خود ہی بتانے لگیں:

”ارے صحن میں کوئی چارپائی ٹیڑھی ترچھی ہو تو میرے سر میں درد شروع ہو جاتا ہے.....“

اپنی وضع قطع، لب و لہجہ، گفتار و کردار میں وہ سو فیصد خاندانی مکاؤں کی سی خوبیاں رکھتیں..... جب بھی نسبت روڈ جانا ہوتا۔ یعنی، عارفہ اور زہرا (جیسے پیار سے منی یو کہا جاتا بعد ازاں اس سے رشتہ بھی قائم ہو گیا) کے ساتھ خوب کمپنی رہتی..... اوٹ پٹانگ باتیں، ہنسی کے فوارے، قہقہے اہلتے..... وہ روایتی ماؤں کی طرح ماتھے پہ بل ڈال کر آنے کی بجائے بڑی محبت سے شریک محفل ہو جاتیں..... نہ گفتگو کے موضوع بدلتے، نہ کچھ چھپانے کی کوشش کی جاتی..... وہ سب سنتی اور دیکھتیں..... مسکراتیں اور کہیں کہیں رہنمائی کا حق بھی ادا کرتیں۔ اکثر نور کی ڈاک ہمارے سامنے کر دیتیں..... ایسے میں ایک خط کھولا تو لفافے پرائڈر لیس کی جگہ پر لکھا ہوا تھا۔ ۵۶ نسبت سڑک، لاہور..... ہم نے اچھل

اچھل کر ہنسنا شروع کیا ہنستے ہنستے بل پڑ گئے لیکن وہ بس مسکرا کر ہی خوشی کا اظہار کرتیں..... بحیثیت مدیرہ بچوں کی اکثر تحریریں بہت فضول، بچکانہ ہوتی تھیں انھوں نے کبھی اس پر ”بچکانہ تحریروں“ کے کمنٹس نہیں دیے۔

ایسے ہی ایک دفعہ جب میں اپنے چھوٹے چھوٹے دکھڑے لے کر بیٹھ گئی اور مینا باجی کہا تو مسکرا کر کہنے لگیں۔ ”بھئی تم تو بہت چھوٹی ہو، باجی تو صحیح نہیں لگتا.....“ خالہ کہہ لیا خالہ باجی.....“

”نہیں خالہ تو ہر گز نہیں کہوں گی.....“ میں نے قطعیت سے کہا۔

”وہ کیوں؟“ انھوں نے اپنے مخصوص حیرانگی والے انداز میں کہا۔

”وہ ایسے کہ نانا ابو کی چار بیویوں سے ماشاء اللہ دس گیارہ خالائیں موجود ہیں ہاں پھوپھیاں صرف دو ہیں اس لیے میں آپ کو مینا پھوپھو کہوں گی.....“

”ہاں بھئی یہ ٹھیک ہے.....“ انھوں نے جھٹ سے رضا مندی ظاہر کر دی۔ پھر پھوپھو بننے کے بعد انھوں نے بہت مزے کے آلو کے کباب بھی بنا کر کھلائے..... لکشمی چوک کے سموے اور بھلے بھی کھلائے۔

بحیثیت شاعرہ ان کی نزاکت، نفاست، ادب آداب سب ٹاپ کلاس تھے۔ ایک اچھی سے اچھی شاعرہ کی تمام صفات ان میں بدرجہ اتم موجود تھیں لیکن شاعروں والے رنگ ڈھنگ نہ تھے۔ مجھے گھیر گھار کے انھوں نے شعر سنانے کی کوشش قطعی نہ کی۔ البتہ اس کچی عمر میں کس قسم کا ادب او

سب پر مینا پھوپھو کا کلام حاوی لگا..... شراب یا ذہنیں رہتے
لیکن کچھ مصرعے اب بھی ان کی خوبصورت مدھر آواز میں
کانوں میں رس گھول رہے ہیں۔

یہ دل کے معاملے ہیں ان کو اہل دل سمجھتے ہیں
(قائد بہن! ”معاملے“ کی ’ع‘ دب رہی ہے، لفظوں کی
ترتیب کچھ اور رہی ہوگی۔ ص ۱)

اور

یہ بجھے ہوئے چراغوں کی زبان کیا کہے گی
بعد میں سب اہل مجلس کھانے پینے میں مشغول ہو گئے
انہوں نے بہت دیر تک مجھ سے گفتگو کی..... ہر علاقے کے
اپنے طور طریقے ہوتے ہیں ان کی کوشش ہوتی کہ جو صحیح ہے
وہ سب اپنائیں اس لیے باتیں کرتے کرتے ایک دم میں
نے کسی خاتون کا ذکر کیا کہ انھیں سینے کا کینسر ہے..... انہوں
نے میرا ہاتھ فوراً پکڑا اور کہا، ہم نے سنا ہے جس جگہ تکلیف
ہو وہاں کا اشارہ کر کے یاد ہاں ہاتھ رکھ کر نہیں بتاتے۔ یوں
وہ ہر بات میں تربیت کو مقدم رکھتیں بہت محبت کرنے والی
تھیں۔ میں نے اپنی بچیوں کو بطور خاص ان سے ملوایا کہ یہ
مدیرہ نور ہی نہیں میری مینا پھوپھو بھی ہیں۔ بہت خوش ہوئیں
بچیوں کو پیار کیا۔ آتے ہوئے بہت نفیس سا کینڈل سیٹ مجھے
تحفہ دیا۔ اپنی زندگی میں جب آخری دفعہ وہ فیصل آباد
آئیں تو میں نے بارہا پروگرام بنائے کہ میں ان سے ضرور
ملوں میری تحریروں میں سے جو انھیں پسند آتی تو دل کھول کر
تعریف کرتیں ان کے مسلک میں دوسروں کی حوصلہ افزائی
اولین تھی۔ خاص طور پر میرے رپورٹاژ پر ”سیسے بے خبرے

رشاعری نقصان دہ ہے یہ انہوں نے بہت اچھے انداز میں
مجھے سمجھایا۔ شاید اسی وجہ سے میں نے ترقی پسند ادب پڑھا
ضرور لیکن ان کی ہدایات کی روشنی میں..... ان کی شاعری،
بامقصد اور مترنم ان کی گفتگو مدلل ہوتی۔ جب اور جہاں بھی
وہ مجھے ملتیں بہت گرجوشی سے ملتیں..... زہرا کی شادی کے
بعد تو قریبی تعلق بھی ہو گیا۔ اپنی دل کی بیماری کے بعد وہ
جب فیصل آباد آئیں تو زہرا نے مجھے فون کر کے کہا۔

قائد امی آئی ہوئی ہیں اور تم سے ملنا چاہتی ہیں.....
میں نے میاں صاحب کو ساتھ لیا اور چھوٹے ڈیڑھ دو سالہ
بیٹے کو اور فیصل آباد روانہ ہو گئی۔

مدتوں بعد ملنا ہوا..... انہوں نے میرے متعلق کرید
کرید کر کوئی سوال نہیں کیے البتہ جو سوال کرتیں جواب میں
اپنا مسئلہ بیان کرتی تو فوراً جواب دے دیتیں۔ اک طویل
عرصہ کے بعد ان کی گفتگو نے بھولا بھری یاد دلا دی..... یہ
مصرعہ ذہن میں آیا۔

پہلی بار نظروں سے چاند بولتے دیکھا

ان کی پرورش مخصوص ماحول میں ہوئی اور وہ سب ان
رکھ رکھاؤ، تہذیب، شائستگی ان میں نظر بھی آتی تھی..... اپنی
بچپن کی داستان انہوں نے جب سنائی تو مجھے اپنے اس سوال
کا جواب ملا کہ ان کے چہرے پر وقار کے ساتھ ایک حزن کی
سی کیفیت کیوں رہتی ہے..... اپنے ادیبوں اور شاعروں کو وہ
دنیا کا بہت بڑا سرمایہ سمجھتیں اور ان کو اہمیت دیتیں۔ ایک
دفعہ فیصل آباد میں حریم ادب کی میٹنگ میں بھی ان سے
ملاقات ہوئی۔ جس میں ادیبائیں بھی تھیں۔ لیکن مجھے ان

تیرا لیا شہر بھنھوڑ، کا عنوان انھیں اتنا پسند آیا کہ محشر خیال میں بھی ذکر کیا، مجھ تک بھی زبانی کلامی تعریفی کلمات بھجوائے..... میں نے انھیں کبھی بچوں سے الجھتے یا بیزار ہوتے نہیں دیکھا۔ اکثر ہر چیز کا مثبت پہلو سامنے رکھتیں۔ اپنے بیٹے کے پاس کراچی میں قیام کے دوران انھوں نے مجھ سے فرمائش کی کہ اگر ہو سکے تو ۶۰ء کی دہائی سے طبع شدہ ان کا شاعرانہ کلام کہیں سے ملے تو فوٹو کا پی بھجوا دو۔ میں نے بہت خوشی سے یہ کام کیا اور دو چار دن کی محنت سے ان کا پرانا شاعرانہ کلام انھیں روانہ کیا۔ شعور کی عمر میں آکر میں نے جب یہ کلام پوسٹ کرنے سے قبل پڑھا تو بے اختیار میرے دل میں ان کی عظمت بڑھ گئی..... یہ ملاؤں جیسا حسن، دانشوروں جیسا تدبر، شاعروں جیسی نفاست، نزاکت والی باوقار خاتون اگر اپنا کلام لوگوں تک پہنچانے کے لیے میڈیا کا سہارا لے..... پی آر بہت اچھی ہو تو آج کی شاعرات کہاں جائیں گی؟ وہ ریا، نمود و نمائش سے یکسر بے نیاز تھیں۔ میں نے ان میں بہت سوز اور للہیت دیکھی۔ آج..... آج..... یہ سطور لکھتے ہوئے میرا دل رو رہا ہے..... اگر ان کی خوبیاں بانٹیں جائیں تو درجنوں افراد میں تقسیم کر کے بھی باقی رہ جائیں..... میرا قلم..... بار بار رک رہا ہے..... میرا دل پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ ان جیسی ہستیاں اب دوبارہ نہیں آئیں گی۔ وہ جو بچوں کے اندر ”بڑی شخصیت“ کا کھوج لگا کر ان کی تعمیر کرتیں اور ان کی چھوٹی چھوٹی دلچسپیوں میں حصہ لیتیں، صلاحیتیں اجاگر کرنے کے لیے شوق دلاتیں اور جب بڑوں کے پروگراموں میں موجود ہوتیں تو گمنام سپاہی کی طرح

پیچھے رہتیں..... خطابت کے جوہر دکھانے یا نمایاں ہونے کا انھیں چنداں شوق نہ تھا۔

میرے آپ کے تعریفی کلمات یا خراج عقیدت کی سطور حق ادا نہیں کر سکتیں..... ان کے پاس اللہ نے تعریفی سرٹیفکیٹ لینے کے لیے بہت سی خوبیاں ہیں۔ میرا اللہ ان کو اپنی جو رحمت میں جگہ دے۔ ان کی للہیت کو قبول کرے، با مقصد زندگی گزارنے پر جو وقار، تمکنت اور شان دنیا میں عطا کی آخرت میں اس سے بدرجہا بہتر اجر عطا کرے۔ ان کی شاعری کی محفل عرش کے سائے تلے ہو..... جس طرح وہ مجھ جیسی کمتر کو نمایاں کرتیں بلکہ میں نے بہت سے ان بچوں کو دیکھا جنھوں نے قلم ہاتھ میں لے کر چلانے کا آغاز ہی کیا تھا انھیں ”ہماری بہت اچھی مصنفہ“ کہہ کر تعارف کرواتیں۔ اس طرح میرا پیارا رب روز حشر ان کو بھی ”ہماری بہت اچھی شاعرہ“ کہہ کر متعارف کرائے۔ یہاں ان کی مسکراہٹ ہمیں بہت بھلی لگتی تھی۔ انھیں ہنستا دیکھ کر خیال آتا۔

تم جو ہنستے ہو تو پھولوں کی ادا لگتے

ہو

اور چلتے ہو تو اک بادِ صبا لگتے ہو

اسی طرح میرے اللہ کے انعام و اکرام پر وہ خوش ہو رہی ہوں۔ ان کے صحیح قدردان دنیا والے نہیں وہاں والے ہوں۔

خواب پوش آنکھوں میں آنسوؤں کا

جانا

بھر

حسرتوں کے ساحل پر تیلیوں کا مرجانا

جس کی ہواؤں میں خوشبوؤں کا ڈر

جانا

دل کے گرم صحرا میں حشر اک بپا ہونا

درد لا دوا ہونا کیا بہت ضروری تھا

اب تیرا جدا ہونا؟؟



ملکہ حسن بیان

کی ہم جلیسی ملی۔ میں نے ان کی رفاقت میں بہت کچھ سیکھا۔ حکمت و دانائی کے بے شمار اسباق، گفتگو کا ٹھہرا ٹھہرا بیٹھا انداز، خوش خلقی اور تہذیب و شائستگی تو ان پر ختم تھی۔ میرا فرض بنتا ہے کہ میں نو جوان نسل کو اس شخصیت سے روشناس کرواؤں جنہوں نے اسلامی اور تعمیری ادب کو پروان چڑھانے میں اپنی زندگی کھپا دی۔ ان کی رہنمائی میں ہمیں تقویٰ، قناعت، پر امید، خود احتسابی، پاکیزگی، حب الوطنی اور امن کے دروس سیکھنے کو ملے۔

زندگی کی کڑی دھوپ میں کھڑے ہوئے لوگ جن کا کوئی پرسان حال نہیں ہوتا ان کیلئے سامانِ ابر تیار کرنے اور مضبوط سائبان مہیا کرنے کیلئے انہوں نے ادبی رہنماؤں کی ایسی کھیپ تیار کی جو ان بھٹکے اور ستائے ہوئے لوگوں کو غیر محسوس طریقے سے ایسی گھنی چھاؤں دے سکیں جو صرف اللہ اور اللہ کے رسولؐ کے بتائے ہوئے طریقوں پر چلنے سے ہی مل سکتی ہے اس کھیپ کی تیاری کیلئے ہر ماہ ایک ادبی میٹنگ کا اہتمام کیا گیا۔

مینا خالہ کے ساتھ جوار باب بست و کشاد شامل تھے ان کی سرپرست اعلیٰ حمیدہ بیگم تھیں جن کی رہنمائی میں یہ گوہر آبدار تیار کئے جا رہے تھے۔ 1950ء کی دہائی سے 1970ء کی دہائی تک یہ میٹنگ مختلف وقفوں سے ہوتی رہی مگر اس

محترمہ بنتِ محبتی مینا صاحبہ جن کا اصل نام مریم تھا۔ 19 مئی 2011ء کو اس دار فانی سے عالمِ لا فانی کی طرف رخصت ہوئیں۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ آپ خواتین کے رسالے ماہنامہ بتول اور بچوں کے رسالے ماہنامہ نور کی مدیرہ اور ادارہ بتول کی سرپرست اور صدر تھیں۔

دوسروں کے لئے تو بنتِ محبتی مینا تھیں مگر میرے لئے وہ مینا خالہ تھیں۔ ابھی پانچ چھ ماہ قبل میری ان سے آخری ملاقات ادارہ بتول کی میٹنگ میں ہوئی۔ جو بیتِ احسن اسلامیہ پارک میں منعقد ہوئی تھی۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ یہ میری ان سے آخری ملاقات ہے۔ میری آنکھ کے پردے نے ان کا مسکراتا ہوا نہ بھولنے والا چہرہ اپنی سکریں میں جذب کر لیا ہے ان کی تصویر بار بار منعکس ہو کر میری نگاہوں کے سامنے آرہی ہے۔ ان سے رخصی کے وقت میں نے جاتے جاتے مڑ کر کہا میں دل بھر کر مینا خالہ کو دیکھ تولوں، نہ جانے پھر کب ملاقات ہو۔

میں کافی دیر سے آنکھیں بند کئے بیٹھی ہوں۔ ان کو خراج تحسین پیش کرنے کیلئے مناسب اور موزوں الفاظ مجھے نہیں مل رہے جو ان کے شایانِ شان ہوں اور ان کی شخصیت کے صحیح عکاس بھی ہوں۔

میں اپنے آپ کو بہت خوش قسمت سمجھتی ہوں کہ مجھے ان

میں باقاعدگی نہیں تھی۔ سال میں ایک یا دو مرتبہ ہو جاتی۔ مگر 1981ء میں پاکستان کے مختلف شہروں میں ادبی اجلاس ہر ماہ کی آخری جمعرات کو ہونا قرار پائے۔ لاہور میں اس کا آغاز مولانا مودودی کی صاحبزادی اسماء مودودی کے ہاں سے ہوا پھر کچھ عرصہ کے بعد یہ اجلاس اسلامیہ پارک میں سعیدہ احسن صاحبہ کے ہاں مسلسل 25 سال سے اپنے وقت مقررہ پر ہو رہا ہے۔

اس ادبی میٹنگ کو شروع ہوئے ابھی سال بھر بھی نہ ہوا ہوگا کہ اس کا نام رکھنے کا مرحلہ آیا۔ مینا خالہ نے بتایا کہ تین نام زیر غور ہیں ہمیں ان میں سے ایک نام منتخب کرنا ہے۔ ہم سب کو رائے دینے کیلئے کہا گیا۔

سب سے فردا فردا پوچھا گیا اور آخر میں حریم ادب پر سبھی متفق ہو گئے۔ شروع شروع میں محترمہ بنت الاسلام صاحبہ اس کی صدر تھیں اور مینا خالہ سیکرٹری کے فرائض انجام دیتی رہیں ان کی رفاقت کے بعد مینا خالہ صدر مجلس قرار پائیں۔

حریم ادب میں سبھی لکھاری اپنی اپنی تحریریں پڑھتے اور ہر تحریر پڑھنے کے بعد اس پر جامع تبصرہ ہوتا ہر کسی سے باری باری تبصرہ کروایا جاتا اور آخر میں مینا خالہ نہایت مدبرانہ اور فہم و فراست سے بھرپور انداز میں تنقید فرماتیں جو مثبت بھی ہوتی اور منفی بھی۔ منفی اس انداز میں کہ پڑھنے والے کو قطعاً برا نہ لگتا اور نہ ہی ایسے کہ اس کا دل ہی ٹوٹ جائے پہلے اس کے پڑھے ہوئے مضمون کی اچھے پہلوؤں کی نشاندہی کرتیں بعد میں خامیوں پر نگاہ ڈالتیں۔ ان کا تبصرہ

سارے پروگرام کی جان ہوا کرتا تھا۔ لفظوں کا چناؤ بہترین ہوتا تبصرہ اتنے نپے تلے الفاظ میں کرتیں جیسے کوزے کو دریا میں بند کر دیا گیا ہو۔ ان کا تبصرہ سننے کیلئے دور دور سے لوگ اس ادبی محفل میں شامل ہوا کرتے تھے۔ وہ ایسی نقاد تھیں جنہوں نے ہمیں ادب سے پیار کرنا سکھایا۔ ہمیں ادب شناس بنایا۔ ہمارے دلوں میں لکھنے کی تڑپ پیدا کی۔ ان کی ذہین آنکھیں، کشادہ پیشانی، شیریں لب و لہجہ جواہل زبان کی خاصیت ہوا کرتا ہے۔ اسی رسیلی چاشنی نے ہماری اس انجمن کو چار چاند لگا دیئے نہ چاہتے ہوئے بھی ادب سے ہماری محبت گہری ہوتی چلی گئی۔ وہ ایک بات بار بار کہتیں کہ جوانی میں لکھ لو جتنا لکھنا ہے بڑھاپے میں انسان کچھ نہیں لکھ سکتا۔ میں ان سے کہتی کہ ابھی بچے چھوٹے ہیں، گھروں کے کام کاج میں لکھنے کی فرصت کسے ہے۔ مگر وہ پھر اپنی بات دہراتیں۔ بڑھاپے میں کئی بیماریاں انسان کو گھیر لیتی ہیں جوانی کے وقت کو غنیمت جانو۔

حمیدہ بیگم، بنت الاسلام، سعیدہ احسن، زبیدہ بلوچ کے بعد آج میں نے ایک اور ماں کو کھو دیا ہے۔ میری امی کی عزیز سہیلیوں میں ان کا نام بھی آتا ہے۔ اسی لئے میں اپنے ہر طرح کے مسئلے ان کے سامنے رکھ دیا کرتی وہ نہایت موزوں اور نیچے تلے الفاظ میں میری ہر طرح سے تسلی کیا کرتیں۔ ان سے اپنا مسئلہ بیان کرنے کے بعد بہترین حل میری مٹھی میں ہوتا۔ ان سے مشوروں کے بعد مجھے ایسا لگتا جیسے سیاہ رات صبح کی روشنی اپنی آغوش میں لے لیتی ہے یا تیز دھوپ میں چلنے کے بعد میں نے کسی شجر سایہ دار میں پناہ

لے لی ہو۔

کام کر رہے ہیں وہی اس کی تشہیر کرے گا۔ ہمیں چاہیے کہ ہم اپنا کام کریں اور وہ اپنا کام کرے گا۔ خوشبو کو پھیلنے سے کوئی روک نہیں سکتا۔ شاید اسی لئے انہوں نے اپنی شاعری کو کتابی شکل نہیں دی کہ جس رب کیلئے کام کیا ہے نمود و نمائش کی خواہش سے وہ ناراض نہ ہو جائے۔ کہیں دل میں یہ بات نہ آجائے کہ مینا بہت بڑی شاعرہ ہیں۔

وہ ایسے ادب کی قائل تھیں جس میں پند و نصائح نہ ہوں۔ کہانی کو بے نتیجہ چھوڑ دیا جائے۔ قاری خود فیصلہ کرے کہ اسکا آخر کیا ہونا چاہیے۔ کہانی میں بے حیائی کی تشہیر نہ ہو، اشارتاً ایسی بات کہہ دی جائے کہ ”کچھ بھی نہ کہا اور کہہ بھی گئے“ کے مصداق بات بن جائے بچوں سے خصوصی محبت رکھتی تھیں ہم سب سے اصرار سے کہتیں کہ بچوں کو ضرور ساتھ لایا کرو۔ بچے جو کچھ اپنے بچپن میں دیکھتے اور سنتے ہیں وہ ان کے ذہن میں سب کچھ ہمیشہ کیلئے نقش ہو جاتا ہے۔ میں اپنی بیٹیوں کو دو چار بار سے زیادہ نہ لے جاسکی کیونکہ پڑھائی کی مصروفیات آڑے آتی رہیں۔ میری بیٹی یعنی اور علیہ ان کا ذکر کچھ یوں کرتی ہیں جیسے ان کے منہ میں کسی نے شیرینی بھر دی ہو۔

اسلام اور اپنے ملک پاکستان سے محبت کا یہ عالم تھا کہ جب بھی اخبار یا رسالے میں کوئی کالم پڑھتیں جس میں ملکی مفاد یا اسلام کے خلاف کسی سازش کا تذکرہ ہوتا یا ٹی وی کے بیہودہ پروگراموں کی بات ہوتی تو اسے حریم ادب میں ضرور پڑھواتیں تاکہ ادب کے ساتھ ساتھ نئے لکھنے والے حالات حاضرہ سے آگاہ رہیں۔

ویسے تو میں انہیں اپنے بچپن سے جانتی تھی مگر ان سے جان پہچان کا باقاعدہ سلسلہ حریم ادب کے ذریعے ہوا۔ وہاں جا کر مجھے احساس ہوا کہ میں محبتوں کے ایسے سمندر میں داخل ہو چکی ہوں جہاں نہ مجھے طغیانی کا ڈر ہے اور نہ ہی ڈوبنے کا بلکہ میں تو ان چاہتوں میں مل کر خود بھی اس سمندر کا حصہ بننے جا رہی ہوں جس کے باسیوں کا مقصد کشتیوں کو پار لگانا ہے نہ کہ ڈوبنا۔ معلوم نہیں میں اس بحر بیکراں کا حصہ بن پاؤں گی یا نہیں جس کا مقصد بھولے بھٹکوں کو سیدھا راستہ دکھانا ہے۔

مجھے یاد ہے جب میں نے حریم ادب میں اپنا پہلا افسانہ ”احساس کی صلیب“ پڑھا تو اس میں ایک جملہ تھا ”وہ ان دونوں کی محبت کی شادی تھی“ میرا یہ جملہ سنتے ہی وہ چونک گئیں، پہلا افسانہ اور اتنے میچور الفاظ تم نے کون کون سے ادیبوں کو پڑھا ہے؟ انہوں نے فوری طور پر سوال کیا۔ ان کے اس جملے نے میری رہنمائی کی کہ اچھا لکھنے کے لئے بہت زیادہ مطالعہ درکار ہے اور یوں میں نے اردو ادب کے بہت سے افسانہ نگاروں کو پڑھنا شروع کیا۔

ایک بار میں نے ان سے کہا ہماری حریم ادب کے اجلاس پچھلے بیس سال سے باقاعدگی سے ہوا ہے ہمیں چاہیے کہ ہم اخبار میں باقاعدہ رپورٹ چھپوائیں اور اس کی تشہیر کریں تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ اس میں شرکت کر سکیں مگر انہوں نے اس تجویز کو مسترد کر دیا اور کہا جس دن ہمارے دلوں میں شہرت پانے کی خواہش پیدا ہو گئی اس دن ہماری تحریریں ہمارا ادب بیکار ہو جائے گا۔ جس رب کریم کیلئے ہم

اپنے شوہر عبدالسلام خان صاحب کی وفات کے بعد تو جیسے اداسیوں نے انہیں گھیر لیا تھا۔ اپنے میاں اور لاہور شہر کے چھٹنے کے ذکر پر ان کی آنکھیں چھلک پڑتیں۔ پھر وہ اپنے بیٹے سہیل کے پاس کراچی شفٹ ہو گئیں اور ہماری حریم ادب سونی سونی رہ گئی۔

آپ بہترین شاعرہ تھیں۔ آپ کی شخصیت کو دیکھ کر لگتا تھا جیسے شاعرہ کا لفظ آپ کیلئے تخلیق کیا گیا ہے۔ حسن بیان کی سلطنت میں کم لوگ بادشاہ ہوتے ہیں وہ ایسی شاعرہ تھیں جو شاعری کے میدان میں بھی حکمران کی طرح دکھائی دیتی تھیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ وہ ملکہ حسن بیان تھیں تو بے جا نہ ہوگا۔ نبی کریمؐ سے اس قدر محبت تھی کہ اپنے نعتیہ اشعار سناتے ہوئے اکثر ان کی آنکھیں اشکبار ہو جاتیں۔ خود بھی روتیں اور ہمیں بھی رلاتیں۔

میں نے مینا خالہ کو اپنے بیٹے اور بیٹیوں کی شادیوں میں سب سے بے بھی دیکھا ہے اور غم و الم میں بھی ان کے ساتھ شریک رہی ہوں مگر آج جب وہ خود اس دنیا میں نہیں رہیں تو ہم کیا ان کے رشتہ دار بھی ان کے آخری دیدار سے محروم رہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کیلئے دہی کی مٹی منتخب کی ہسپتال جانے سے پہلے کلمہ طیبہ پڑھ کر گھر سے نکلیں اور دودن بعد اپنے پیدا کرنے والے سے جا ملیں۔

دنیا سے جانے سے پہلے وہ اپنے پیچھے علمی و اصلاحی ادب کی ایسی کھپ چھوڑ گئیں جو ان کیلئے صدقہ جاریہ ہے جس کے نمایاں ناموں میں لاہور سے فرزانہ چیمہ، سمیہ مسعود عبدہ، ناہید زہد، فرات غضنفر، صائمہ اسما، ذروہ احسن اور راقمہ شامل

ہیں۔

اللہ تعالیٰ انہیں اپنے جوار رحمت میں خاص جگہ دے (آمین)

کون کہتا ہے کہ موت آئی تو مر جاؤں گا
میں تو دریا ہوں سمندر میں اتر جاؤں گا



سیدہ حمیرا مودودیؒ

رفتید و لے نہ ازدل ما

آپ اہل بیتؑ کی مینا دے درے سنخے قدے اسی قافلے میں شامل تھیں جس کی سالار خالہ حمیدہ بیگم مرحومہ تھیں۔ انہی کی تربیت یافتہ تھیں۔ اسی قافلے میں آپا رخشندہ کوکب، خالہ نیر بانو اور دیگر بھی شامل تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے اپنی پوری پوری زندگیاں تحریک اسلامی کی خدمت میں کھپا دیں۔ انہوں نے اپنی زندگی کا ہر لمحہ اسی فکر میں گزارا کہ یہ پاکستان جو اللہ کے دین کو قائم کرنے کیلئے بنایا گیا تھا حقیقت میں ویسا ہی بنے جیسا خواب علامہ اقبالؒ نے دیکھا تھا۔ جس کی خاطر لاکھوں مہاجرین نے اپنی جانیں قربان کیں اور لاکھوں بیٹیوں نے اپنی عصمتیں لٹائیں۔

اللہ تعالیٰ ان کی کوششوں کو قبول فرمائے اور ہم کو بھی ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق فرمائے (آمین)

مینارۂ نور

انہوں نے ہمیں اپنی روایتوں کی پاسبانی کے ساتھ دور جدید کے تقاضوں سے نبرد آزما ہونا سکھایا

”ٹک ٹک ٹک۔ السلام علیکم! 786 میٹر بینڈ پر یہ ریڈیو نورستان ہے۔“ سارا بچپن ہر ماہ اسی ٹک ٹک اور اپنی طرز کے انوکھے یعنی کاغذ پر چھپے ریڈیو نورستان کے پروگرام دیکھنے کے لئے بچوں کے رسالہ ”نور“ کے انتظار میں گزرا۔ 80 کی دہائی کے ابتدائی سالوں میں جب ہم پشاور سے لاہور آئے تو حلقہ خواتین کی مرکزی مجلس شوریٰ میں ایک بڑی پروقار اور سنجیدہ سی شخصیت سے تعارف ہوا کہ یہ مینا آپا ہیں۔ یہ سب خواتین جو مرکزی شوریٰ کی ارکان ہوتی تھیں، آپا جی بلیقیں صوفی آپا ام زبیر اور خالہ جان زہرا وحید کے ساتھ ہمارے گھر ملاقات کے لئے اہتمام سے آیا کرتی تھیں۔ میں ان سب کے ساتھ وقت گزارنے اور ان سے سیکھنے اپنے گھر کے ساتھ واقع مرکز خواتین پہنچ جایا کرتی تھی۔ مینا آپا سے کبھی بچپن میں سوچا بھی نہ تھا کہ ایسے ملاقات ہوا کرے گی۔ منصورہ چونکہ مرکز تھا اور خواتین کا مرکز ہمارے گھر کے بالکل پچھواڑے میں واقع ہے اس لئے مہینے میں ایک دو دفعہ ملاقات ہو جایا کرتی تھی آپا ام زبیر اور آپا بلیقیں صوفی نے ایک علم و ادب کانفرنس میں جس کا اہتمام محترم و مکرم سید اسعد گیلانی مرحوم نے کیا تھا، مجھ سے میری پہلی تحریر (جو کہ جہاد افغانستان کے پس منظر میں لکھا گیا ایک افسانہ تھا) لکھوائی۔ وہ تحریر میں نے رات کو بیٹھ کر لکھی اور صبح مرکز

جا کر حلقہ علم و ادب کے خواتین سیشن میں سنائی۔ مجھ یاد ہے مینا آپا نے جماعت کی اس وقت کی ممتاز لکھاریوں کے درمیان میں بیٹھ کر میری تحریر سنی۔ پھر ان سب کی رائے سے وہ تحریر زبیدہ خالہ جان (زبیدہ اسعد گیلانی) کو دے دی گئی اور جب حلقہ علم و ادب کا مجلہ چھپا تو اس میں وہ تحریر بھی چھپی تھی۔ میری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ اُس کے بعد خالہ زہرا (زہرا عبدالوحید) مجھے حریم ادب کے اجلاس میں لے کر جاتی رہیں جو ننھی آپا یعنی سعیدہ احسن کے گھر یا قاعدگی سے منعقد ہوتا تھا۔ میری اُس وقت کی مینا آپا کے حوالے سے بہت خوبصورت یادیں ہیں۔ مجھے وہ کئی دفعہ اپنے گھر بھی ساتھ لے گئیں۔ جب 1983ء میں بلدیاتی الیکشن میں خواتین کی نمائندگی کا فیصلہ ہوا تو ہر معاملے میں بہت پیچھے رہ کر جماعت کا خاموشی سے کام کرنے والی کارکن نے جماعت کا فیصلہ تسلیم کیا اور آپا جان بیگم واصل کے ساتھ ان کو لاہور جماعت کی طرف سے خاتون کونسلر بنا دیا گیا۔ مجھے یاد ہے کہ وہ اُس کی رہنمائی لینے کی خاطر بھی ہمارے گھر آیا کرتی تھیں۔

امی کو جب میں نے پشاور فون کیا کہ مینا آپا رخصت ہو گئی ہیں تو انہوں نے گلوگیر لہجے میں فون پر مجھ سے ہی تعزیت کی کہ راجیل ہم ایک دوسرے سے ہی تعزیت کر

ہمارے قاضی صاحب (اُس وقت وہ جماعت کے سیکرٹری جنرل تھے) کے ساتھ صابرانہ رفاقت کا تعلق ہے۔ یہ کیا کم کام ہے کہ آپ نے انہیں اس جماعت کے کام کے لئے مکمل طور پر فارغ کیا ہوا ہے اور اُن کے بچوں کی تربیت کر کے انہیں بھی جمعیت، جماعت کے کاموں سے لگایا ہوا ہے۔ وہ اُن کی حوصلہ افزائی کی وجہ سے رکن بنیں۔ امی کہتی ہیں کہ وہ بہت باوقار اور سادہ طبیعت کی تھیں۔ ایک دفعہ بہت خوبصورت دوپٹہ اوڑھے ہوئے تھیں میں انہیں دیکھ کر مسکرائی تو وہ ہنس دیں، میں نے پوچھا کہ آپ کیوں ہنسی ہیں تو دوپٹے کو دیکھ کر مسکرانے لگیں کہ آپ اسے ہی دیکھ کر مسکرائی ہیں نا؟؟

1993ء کی تلخ یادیں بھی ہیں جب کچھ افراد نے میرے آغا جان پر طعن و تشنیع کا ایک طوفان اٹھا رکھا تھا مگر مینا آپا کے حوالے سے ہمیں کبھی بھی کوئی تلخ بات نہیں سنائی دی۔ ہمیشہ بہت محبت اور اپنائیت کا تعلق قائم رکھا۔

اُن کی یاد میں ایک نشست میں خالہ جان زہرا وحید، خالہ جان زبیدہ اسعد گیلانی اور خالہ ثریا اسماء اُن کے ساتھ بیٹے لمحات کا ذکر کر رہی تھیں تو خالہ زہرا ہمیں کہنے لگیں کہ میں مرجاؤں تو بالکل اس طرح کے پروگرام نہ کرنا، یہ قرآن و سنت سے ثابت نہیں ہیں۔ میں نے کہا کہ خالہ جان ممنوع بھی نہیں ہیں اور حضور ﷺ نے تو تلقین کی ہے کہ اپنے جانے والوں کا اچھا تذکرہ کیا کرو، میں اگر آپ سے پہلے رخصت نہ ہوگئی تو میں تو ضرور پروگرام کروں گی اور اگر میں آپ سے پہلے رخصت ہوگئی تو میرے لئے بھی ضرور دعائیہ پروگرام کر

لیتے ہیں۔ میں نے پھر اپنی بہن قاتنہ رابعہ اور نانکھ نصیر سے ان کی بیٹی زہرا نہالہ کا نمبر لیا اور اپنے خاندان کی طرف سے جماعت کی اس بانی رکن کی تعزیت کی جو ہمارے لئے واقعی رہنمائی کا فریضہ سرانجام دیتی رہی تھیں۔ میں اپنی جماعت کے سیاسی شعبے کی ایک کارکن کی حیثیت سے ویسے بھی اپنی ان رہنماؤں کی مداح تھی جنہوں نے ہمارے لئے اس شعبے میں نشان منزل چھوڑے تھے اور جب ہر طرف سے تنقیدی آوازیں اُبھرتی تھیں کہ مولانا نے خواتین کے سیاست میں حصہ لینے پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا تھا اور جماعت اب مولانا کی فکر سے انحراف کر رہی ہے تو ان خواتین رہنماؤں کا سیاسی شعبے میں کام کرنا اُن لوگوں کے لئے ایک مسکت جواب تھا اور میں اُن کے لئے بہت دعا گو رہتی تھی کہ یہ ہمارے لئے اُن Barriers کو توڑنے والی اور Trend Setters تھیں۔ جنہوں نے ہمارے لئے اُن پر خارا ہوں پر پہلے چل کر راہیں آسان، صاف اور روشن کر دی تھیں۔ انہوں نے ہی اپنی روایتوں کی پاسبانی کے ساتھ ساتھ دور جدید کے چیلنجز سے نبرد آزما ہونے کا سلیقہ سکھایا۔

مجھے ویسے بھی اُن سے بہت محبت تھی مگر انسان کو اُن لوگوں سے زیادہ محبت ہو جاتی ہے جو آپ کے والدین سے محبت کا تعلق رکھتے ہیں۔ مینا آپا میری امی جان کی اُن سہیلیوں میں سے تھیں جنہوں نے خالہ زہرا کے ساتھ مل کر اُن کو جماعت کا رکن بنایا تھا۔ جب امی نے اُن سے کہا کہ میں تو آپ کی طرح بہت زیادہ چل پھر کر کام نہیں کر سکتی پھر کیسے رکن بنوں، تو ان سب نے مل کر اُن سے کہا کہ آپ کا

ہو جانا۔ اُن کے حق میں ہماری گواہیوں کو قبول کر لینا۔ اپنی رحمتوں کے صدقے میں ہم سب کو جنت الفردوس میں اکٹھا کرنا اور اپنے عرش کے سائے میں نور کے منبروں پر بیٹھنا نصیب فرمانا! آمین۔



لیجئے گا۔ جس پر سب مسکرا دیئے۔ خالہ ثریا نے آپا مینا کے حوالے سے کہا کہ وہ اپنی زندگی میں ہی نور، بتول اور ادارے کے ٹرسٹ کے کاغذات خالہ زہرا اور ڈاکٹر مقبول شاہد صاحب کے سپرد کر گئی تھیں اور جماعت اُن کے رگ و پے میں رواں دواں تھی۔

حریم ادب کو وہ سالوں تک بخوبی چلا کر ملتان کی جماعت کی ہر دلعزیز رکن اور سابق ناظمہ صوبہ پنجاب خالہ شاہدہ اکرام کے سپرد کر کے گئی تھیں۔ خالہ شاہدہ اکرام نے اُن کی نگرانی میں حریم ادب کو بہت عمدہ طریقے سے چلایا اور پھر اپنی طبیعت کی خرابی کی وجہ سے ذمہ داری دوسروں کے حوالے کر دی۔ اب حریم ادب کو دوبارہ نئے سرے سے پورے پاکستان میں ویسے ہی متحرک کرنے کی ضرورت ہے جس جذبے سے آپا مینا نے اُسے چلایا تھا۔

اُن کا صدقہ جاریہ رسالہ نور اور بتول شاید پاکستان کے وہ واحد ماہنامے ہیں جو کہ بلاناغہ ہر ماہ پچھلے 50 سالوں سے شائع ہو رہے ہیں۔ مینا آپا 50 سالوں تک نور کے لئے لکھتی رہیں اور 50 سالوں کے نور کے ادارے اور ریڈیو نور ستان کے تقریباً 600 پروگرام اُن کا ایسا قلمی اثاثہ ہے جس پر جماعت اسلامی کی اس رہنما خاتون کو ضرور کوئی ایوارڈ ملنا چاہیے تھا۔ وہ اپنے رب کے پاس اس ایوارڈ کو لینے حاضر ہو گئی ہیں۔

آج ان لمحات میں جب وہ پردیس میں منوں مٹی تلے جاسوئی ہیں اپنے رحمان رب سے یہ التجا کرتے ہیں کہ اپنی اس بندی سے جو کہ تیرے دین کا ایک مینارہ نور تھی، راضی

میں آپا..... کچھ یادیں کچھ باتیں

اپنی نسبت ٹھہر جانے کے بعد خیالات بدل جاتے ہیں اور وہ اپنے منگیتر کو مخاطب کرتی ہے۔ اس نظم کو دیکھ کر وہ بہت حیران ہوئیں اور کہنے لگیں یہ تو مجھے یاد ہی نہیں رہی تھی۔ پھر جب میں نے ایک نشست میں ان سے اپنا کلام سنانے کی فرمائش کی تو انہوں نے اسی نظم کا انتخاب کیا۔ اُس نشست میں آپا اُم زبیر مرحومہ بھی موجود تھیں۔ جب انہوں نے آخری بند سنایا کہ

انہیں منظور ہے پھر میرا سہارا بننا
میری دھندلی سی فضاؤں میں اجالا بننا
انہیں منظور ہے اس کشمکشِ طوفان میں
ڈگمگاتی ہوئی کشتی کا کنارہ بننا
اپنے اللہ سے ایک عہد کیا ہے میں نے
مجھ کو وہ عہد بہر حال نبھانا ہوگا

تو آپا اُم زبیر نے انہیں چھیڑا کہ پھر سلام صاحب مان گئے؟ تو وہ ذرا جھینپ گئیں اور انہوں نے جواب دیا کہ وہ سلام صاحب تھے ہی نہیں۔

سب سے زیادہ خوشی کی بات یہ ہے کہ انہوں نے اپنے اللہ سے جو عہد کیا تھا اس کو آخری دم تک نبھایا اور جب جماعت اسلامی میں کچھ لوگوں کو اختلاف ہوا اور ”تحریک

میں آپا سے تعلق تو اسی وقت سے قائم ہو گیا تھا جب پہلے عفت اور بعد میں بتول میں ان کی نظم یا غزل تقریباً ہر شمارہ میں ہی چھتی تھی۔ میرا اس وقت لڑکپن تھا اور مجھے شعرو شاعری کا بہت شوق تھا۔ ان کی غزلیں پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا..... ”گویا یہ ہی میرے دل میں ہے۔“ اس لئے اکثر میں ان کی نظم یا غزل، جو بھی شائع ہوتی زبانی یاد کر لیتی تھی۔ پھر جب بہت عرصہ بعد ان سے کراچی میں ملاقات ہوئی تو میں نے انہیں بتایا کہ مجھے آپ کا بہت سا کلام زبانی یاد ہے اور میں نے یہ سوال بھی کیا کہ آپ نے اپنا مجموعہ کلام مرتب کیوں نہیں کیا تو انہوں نے جواب دیا کہ میں نے کبھی اس طرف توجہ نہیں کی، جو کچھ رسالوں میں چھپ گیا میرے پاس تو اس کا بھی ریکارڈ نہیں ہے۔ پھر انہوں نے مجھ سے یہ کہا کہ اگر تمہیں اب بھی کچھ چیزیں یاد ہیں تو مجھے لکھ کر دیدو فروغ صاحب (جو اس زمانہ میں ادارہ بتول میں منبجرتھے) وہ مرتب کرنا چاہے ہیں میں ان کو دیدوں گی۔ پھر فروغ صاحب بیمار ہو گئے اور جہاں تک میرا خیال ہے کہ ان کا کوئی مجموعہ کلام مرتب نہیں ہوا۔

میں نے ان کو جو چیزیں اپنی یادداشت سے لکھ کر دی تھیں اس میں ان کی ایک نظم تھی ”تشویش“ اس میں انہوں نے ایک ایسی لڑکی کے جذبات کی ترجمانی کی تھی جس کے

اور کہا کہ ان پر تبصرہ ضرور لکھنا۔ وہ اکثر کہا کرتی تھیں کہ تقریر تو چند ہی لوگ سن سکتے ہیں لیکن جب کوئی اچھی تحریر شائع ہوتی ہے تو اس کو ہزاروں لوگ پڑھتے ہیں۔ لیکن میری نااہلی کے میں اس میدان میں پیش رفت نہ کر سکی۔

اللہ تعالیٰ ان کی بہترین میزبانی فرمائے، ان کی تمام کاشوشوں کو اپنی بارگاہ میں شرف قبولیت عطا فرمائے، ان کو وہ سب کچھ عنایت فرمائے جو اس نے اپنے نیک بندوں کیلئے تیار کر رکھا ہے اور تمام پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے آمین۔



اسلامی، کی بنیاد ڈالی گئی تو سلام صاحب بھی تحریک اسلامی میں شامل ہو گئے مگر وہ جماعت اسلامی میں رہیں اور اپنے مورچہ پر مضبوطی سے جمی رہیں۔ تحریک اسلامی والوں کے لئے اس وقت ان کا تبصرہ یہ تھا کہ وہ لوگ دین سے اپنے خلوص کی بنیاد پر علیحدہ ہوئے ہیں کسی گمراہی یا نفسانیت کی بنیاد پر علیحدہ نہیں ہوئے۔

میں آپا کے دل میں وطن کا درد بھی بہت تھا۔ جب ہندوستان سے ہجرت کی، اسکا بھی ان کے اشعار میں ذکر ہے

گو ہم دو آہ چھوڑ کے پنجاب آئے

لیکن رہے نہ پھر دل ہندوستان سے

دور

پھر جب سقوط ڈھاکہ ہوا تو انہوں نے اپنے جذبات کا اظہار کچھ اسی طرح کیا:

مرثیہ دلی مرحوم کا لکھا تھا کبھی

مرثیہ ڈھاکہ وجیسور کا اب کہنا ہے

تو نے کیا کیا نہ سہا سہیل بلا کے ہاتھوں

تجھ کو کیا کیا دلِ ناشاد ابھی سہنا ہے

وہ بچیوں کو نصیحت کرتی ہیں:

میں حسن سیرت کا وہ نمونہ بنوں کہ دنیا پکار اٹھے

یہ کس چمن میں کلی کھلی ہے یہ کس گلستاں کا پھول مہکا

میں آپا سے جب بھی ملاقات ہوتی تھی وہ لکھنے کی

ترغیب دیتی تھیں۔ ایک مرتبہ لاہور میں جب میں ان کے گھر

ملاقات کے لئے گئی تو انہوں نے نور اور بتول تحفہ میں دیے

پیاری نانو

(احمد مجتبیٰ - فیصل آباد)

میرا نام احمد مجتبیٰ ہے۔ میں بنت مجتبیٰ مینا کا نواسہ ہوں۔ وہ مجھے بچپن میں پیار سے چھوٹ کہا کرتی تھیں۔ میں ۱۵ فروری ۱۹۹۷ء میں اپنے نانا کی وفات سے چند ماہ قبل لاہور میں پیدا ہوا اور ۲۰۰۱ء کی مارچ تک اپنی نانو کے ساتھ رہا۔ اگر میں یہ کہوں کہ مجھے نانو نے پالا تو غلط نہ ہوگا۔ اس چار سالہ مسلسل ساتھ کی وجہ سے مجھے اپنی نانو کی خصوصی محبت اور شفقت حاصل رہی۔ وہ جہاں کہیں جاتیں تو ہمیں ضرور یاد کرتیں۔ کہا کرتیں ”اگر چھوٹو اورابی (میرا بڑا بھائی) ہوتے تو بڑا مزہ آتا۔“

وہ جب بھی فیصل آباد آتیں تو ہم بہت خوش ہوتے اور ہمارا دل چاہتا کہ وہ ہمارے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزاریں۔ نانو ہمیشہ ہمارے لئے تحائف لے کر آتیں جس کی ہمیں الگ ہی خوشی ہوتی۔ نانو کی حاصل بات یہ تھی کہ وہ ہمیں ہمیشہ ہر رات سونے سے پہلے دلچسپ کہانیاں سناتیں جس کی وجہ سے ان کے پاس سونے کے لئے ہر بچہ ضد کرتا جب لکٹی والے کی کہانی سناتے سناتے نانو اس موڑ پر آتیں جب چڑیا روو کے لکٹی والے سے رہائی کی فریاد کرتی ہے۔

”میرے ننھے ننھے بچے ہیں
آندھی آئے گی اڑ جائیں گے

بارش آئے گی بہہ جائیں گے
رنگ چوں چوں چوں
تو نانو کے ساتھ ساتھ سننے والے بچے بھی افسردہ ہو جاتے۔ اسی طرح وہ ہمارے ساتھ ”تاتی تاتی پوریاں“ کھیلتیں۔ سارے بچے نانو کے پاس دائرہ بنا کر بیٹھتے اور نانو بڑے ترنم سے پڑھتیں:

”تاتی تاتی پوریاں گھی میں چپوریاں
ساس گئی لکڑیاں پھاڑ کھائیں لکڑیاں
بالا کان پکڑو“

پھر ہم سب بچے ایک دوسرے کا کان پکڑ کر چاؤں میاؤں کرتے۔ غرض نانو بچوں کے ساتھ بچہ بن جاتیں اور ایسے چھوٹے چھوٹے کھیلوں کے ذریعے بچوں کو اکتاہٹ کا شکار نہ ہونے دیتیں۔

جب ہم ذرا بڑے ہوئے اور سمجھدار ہوئے تو نانو اپنے بچپن کی باتیں بڑے دلچسپ انداز میں سناتیں نانو نے ایک دفعہ بتاتا کہ مولانا محمد علی جوہر کے بھائی مولانا شوکت علی نے نانو (جو اس وقت صرف چار پانچ سال کی تھیں) کو اپنی گود میں بٹھایا اور کہا ”بیٹا! نماز ہمیشہ باقاعدگی سے پڑھا کرو۔“ ہم نے نانو کو نماز ہمیشہ باقاعدگی سے ہی پڑھتے

ہوئے دیکھا اور وہ یہ کہتیں کہ امریکہ کا بھی زوال قریب ہے -

نانو کو خوش کرنے کے لئے ہمارے پاس سب سے بڑا ہتھیار ان کو چائے پلانا تھا۔ ہم سب بہن بھائی کچھ کچھ دیر بعد مائیکروویو (Microwave) میں چائے بنا کر دیتے رہتے اور ڈھیروں دعائیں لیتے۔

جب نانو ہمارے پاس آخری دفعہ سردیوں میں آئیں تو گیس کی زبردست لوڈ شیڈنگ ہو رہی تھی اور کھانا پکانا مشکل ہو جاتا۔ تو نانو کہتیں ”ارے بھئی گھبرانے کی بجائے اور حکومت کو برا کہنے کی بجائے کونکوں پر کھانا پکالیا کرو پہلے وقتوں میں ہم تو کونکوں پر ہی پکاتے تھے۔“ ایک دن ہم نے نانو کو اس خواہش کو پورا کرنے کے لئے کونکوں پر سیخ کباب بنائے۔ نانو کے ساتھ ہمارا یہ ”باربی کیو“ بہت یادگار تھا۔ نانو ہر معاملے میں شکرگزاری کے رویے کو اختیار کرتیں اور ہمیں بھی اسی کی تلقین کرتیں۔ اللہ ہماری نانو کی تمام نیکیوں کو قبول کرے اور ہمیں ان کی اچھی باتوں کو اپنانے کی توفیق دے۔ (آمین)

نانو..... دل کے آئینہ میں

(مریم ہمایوں۔ راولپنڈی)

میری نانو بنت مجتبیٰ مینا، لوگوں کے لئے بہت کچھ تھیں مدیرہ نور، شاعرہ، لکھاری، سیاسی کارکن، سماجی کارکن، جماعت اسلامی کی بانی رکن وغیرہ وغیرہ گو کہ مجھے نانو کی ان سب خوبیوں پر ناز ہے مگر میرے لئے وہ صرف میری نانو تھیں۔ صرف میری نانو۔

دیکھا۔ وہ نہ صرف ہمیں نماز پڑھنے کی تلقین کیا کرتیں بلکہ وہ گھر میں کام کرنے والی باجی رانی کو بھی مسلسل نماز پڑھنے کی تلقین کیا کرتیں۔ اس کے علاوہ گھر میں ہونے والے اجتماع اہل خانہ میں نانو بڑی دلچسپی سے شریک ہوتیں اور امی سے کہتیں کہ اجتماع کے بعد بچوں کے لئے کھانے پینے کا کوئی بندوبست ضرور کیا کرو اس سے بچے خوشی کے ساتھ شریک ہوتے ہیں۔

نانو کو جلسے جلوسوں میں شرکت کرنے کا بڑا شوق تھا۔ نانو ہمیں بڑے پر لطف انداز میں یہ واقعہ سنایا کرتی تھیں کہ ایوب دور میں جماعت اسلامی نے جب فاطمہ جناح کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا تو شوکت اسلام، جلوس نکالا گیا نانو کا جلوس میں شرکت کرنے کا بڑا دل تھا مگر گھر والوں کی طرف سے اجازت نہ ملی۔ تو نانا ابو اور نانو یعنی خالہ اور ماموں جان کو لے کر چڑیا گھر کی سیر کا کہہ کر صبح صبح چڑیا گھر پہنچ گئے۔ جانوروں کے کھانے کا وقت تھا، شیر دھاڑ رہے تھے۔ بچوں نے دو گھنٹے سیر کی اور جب مال روڈ پر سے جلوس گزرنے کا وقت ہوا تو نانو اور نانا ابو دونوں بچوں کو لے کر (جواب سو رہے تھے) مال روڈ پر پہنچ گئے اور جلوس میں شرکت کی۔ جب گھر پہنچے تو بچوں کی دادی نے پوچھا ہاں بھی یعنی کیا کہہ رہیں تھیں فاطمہ جناح جس پر یعنی خالہ نے بے ساختہ کہا ”وہ کہہ رہیں تھیں کھا جاؤں گی“ (چڑیا گھر میں دیکھے ہوئے جانوروں کے زیر اثر)۔ نانو یہ واقعہ سنا کر خوب ہنستیں۔ نانو ہمیں بتاتیں کہ انہوں نے انگریزوں کا زوال بھی اپنی آنکھ سے دیکھا اور روس کے سفیر پیچھ کو بھی دم دبا کے بھاگتے

مجھے بچپن میں لاہور میں گرمیوں کی چھٹیاں اچھی طرح یاد ہیں۔ ہم سب خالہ زاد بہن بھائی لاہور میں جمع ہوتے۔ کھیلتے بھی خوب تھے اور لڑتے بھی بہت نانو بڑے پیار سے ہماری صلح کرا دیتیں۔ نانو کا صلح کرانے کا انداز بہت منفرد تھا۔ کبھی کسی کو ڈانٹ نہ پڑی تھی نہ ہی کسی ایک پر الزام ڈالا جاتا کہ یہ برا ہے بلکہ بڑی محبت اور پیار سے ہر ایک کو اس کی غلطی سمجھ میں آجاتی اور کسی کو اپنی بے عزتی بھی محسوس نہ ہوتی۔

بچپن میں ہم سب بچوں کو نانو کو دوا کھلانے کا بہت شوق تھا۔ اس بات پر اکثر ہماری لڑائی بھی ہو جاتی۔ نانو سب میں دوا بانٹ کر خود صبر سے منہ کھول کر بیٹھی رہتیں اور یوں ان کے دوا کھانے کا دورانیہ دس منٹ کی طوالت اختیار کر جاتا ان کو بچوں کی خوشی کا بہت خیال رہتا۔

نانو حساس، محبت کرنے والی اور نرم دل خاتون تھیں۔ ان کو بچوں سے بہت محبت تھی۔ وہ ان سے کھیلتیں، پیار سے باتیں کرتیں اور کبھی ان کو ڈانٹتی نہیں تھیں کسی کو کچھ سمجھاتیں تو اکیلے میں اور اس طرح کہ اسے برا نہ لگے۔ ان کو بچوں کی عزت نفس کا بہت خیال رہتا تھا۔ بچوں کا رونا ان سے بالکل برداشت نہ ہوتا تھا۔ کہتی تھیں کہ رو نہیں میرے دل میں تکلیف ہوتی ہے اکثر بچوں کو خود چپ کروا دیتیں۔

اگر کبھی ان کی طبیعت خراب ہوتی تو اماں ان کو لیٹنے کو کہتیں لیکن اگر کہیں سے میرے دو سالہ بھائی سعد صاحب آن وارد ہوتے تو وہ اپنی طبیعت خرابی کو بھول جاتیں اور سعد کے ساتھ مگن ہو جاتیں اس سے کھیلتیں، باتیں کرتیں اور کہانیاں سناتیں سعد کو بھی نانو سے بہت محبت تھی۔ اکثر آ

کران کو پیار کرتا۔ جب وہ آتیں تو ان کے ساتھ ان کے بازو پر سر رکھ کر سوتا۔

نانو میٹھے کی بہت شوقین تھیں۔ ان کو شوگر تھی اس لئے اماں اور خالہ ان کو اکثر منع کرتیں کہ آپ کو ڈاکٹر نے پرہیز کرنے کو کہا ہے۔ مگر نانو بچوں کو میٹھا لانے کی مہم پر بھیجتیں اور ہم بھی جاسوسوں کی طرح جاتے اور کوئی میٹھی چیز لاتے۔ ہم سب مل کر کھاتے اور نانو ہنستی جاتیں اور کہتیں کہ دیکھو کہیں امی تو نہیں آرہیں، اماں کو پتا نہ چلے اس طرح وہ اتنی سی بات کو بھی ایڈ ونچر بنا دیتیں اور ہمیں واردات کے بعد ثبوت مٹانے کی تاکید کرتیں۔

نانو کی پسند کی کھانے پینے کی چیزوں میں چائے سرفہرست تھی۔ اکثر پوچھتیں کہ کیا ہم نے چائے پی لی؟ اس کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ میرا چائے پینے کو دل چاہ رہا ہے۔

جب میں ان کے لئے چائے لے کر جاتی تو وہ بہت خوش ہوتیں اور مجھے ڈھیروں دعائیں دیتیں۔

نانو ہر چیز ہمیشہ بانٹ کر کھاتیں، چاہے ذرا سا ملا ہو۔ وہ بہت حساس تھیں اور کسی بچے کا دل دکھانا نہ چاہتی تھیں۔

میرے بال بہت لمبے ہیں۔ نانو کے سامنے میں جب بھی بال کنگھی کرتی تو وہ مجھے کہتیں کہ ”اپنے بال مت کھولا کرو، نظر لگ جاتی ہے، میں بھی بچپن میں اپنی اماں سے کہتی تھی کہ لوگ تو اتنے اتنے خوبصورت ہوتے ہیں، کسی کو نظر نہیں لگتی مگر بیٹا نظر واقعی لگ جاتی ہے۔“ پھر میں کنگھی کر کے اپنے بال باندھ لیتی۔

مجھے کتابیں پڑھنے کا بے حد شوق ہے۔ ہر وقت کوئی نہ کوئی کتاب ہاتھ میں ہوتی ہے۔ بے وقت کتابیں پڑھنے پر مجھے ڈانٹ بھی پڑتی مگر جب نانو ہوتیں تو کسی کی کیا مجال! نانو خود بھی کتابیں پڑھنے کی بہت شوقین تھیں ان کے سر ہانے ہر وقت کتابیں ہوتی تھیں سر رکھنے کی جگہ ہو نہ ہو کتابیں ضرور ہوتی تھیں۔

مجھے یاد ہے میرا پہلا مضمون Dawn اخبار کے ایک ہفتہ وار بچوں کے رسالے میں چھپا تھا۔ جب میں نے نانو کو بتایا تو وہ بہت خوش ہوئیں، میری بہت تعریف کی اور حوصلہ افزائی کی پھر مجھے کہا کہ انگریزی میں بھی لکھو اور اردو میں بھی، خاص طور پر ”نور“ کے لئے ان کے کہنے پر میں نے ایک مرغے کی کہانی لکھی اور ان کو سنائی اسے سن کر انہوں نے مجھے بہت داد دی

میں یہ مضمون لکھ رہی ہوں مگر مجھے لگ رہا ہے کہ میں وہ حق ادا نہیں کر پا رہی جس کی نانو جیسی شخصیت حقدار تھیں۔ شاید کچھ لوگ اتنے بڑے ہوتے ہیں کہ ان کے لئے آپ کے الفاظ چھوٹے پڑ جاتے ہیں۔ میری نانو ان میں سے ایک تھیں اللہ ان کی مغفرت فرمائے اور ان کو جنت الفردوس میں اونچا مقام دے۔ آمین

☆☆☆

محشر خیال

رفعت اشتیاق۔ گوجرہ

اگرچہ حالات بہت ناگفتہ بہ ہیں۔ دل خون کے آنسو روتا ہے سمجھ میں نہیں آ رہا کیسے لکھوں۔ حسبِ عادت اداریہ پڑھا۔ صائمہ اسماء صاحبہ نے حالاتِ حاضرہ کے تناظر میں سب کچھ واضح کر دیا۔ پانی سر سے اونچا ہو گیا کیا اب ہمیں کسی معجزے کا انتظار ہے؟ لگتا ہے ہر کوئی دوسرے کو ٹھیک کرنے میں لگا ہوا ہے۔ بتول کے ٹائٹل نے متاثر کیا۔ منفرد اور خوبصورت لگا۔ ڈاکٹر رخسانہ جبین ”آئیے حالات سدھارنے کا عزم کریں“ میں نہایت دردِ دل کے ساتھ رقم طراز ہیں اس پرفتن دور میں اپنا فرض ادا کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ ان کی تحریریں اکثر و بیش تر زیرِ مطالعہ رہتی ہیں۔ ڈاکٹر صاحبہ کو اس قلمی جہاد پر اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے آمین انہوں نے اس دلدل سے نکلنے کیلئے تین نسخے بھی بتا دیئے۔ ۱۔ رجوع الی اللہ ۲۔ قرآن کو تھام لیں ۳۔ نظام کو بدلنے کی جدوجہد۔ علمی دنیا میں صائمہ اسماء صاحبہ نے کتاب دوستی کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے ورلڈ بک اینڈ کاپی رائٹ ڈے پر منعقدہ سیمینار کی روداد لکھ کر آج کی نوجوان نسل پر احسان کیا ہے۔ بقول ڈاکٹر طاہرہ سکندر کے ”ٹی وی، اخبارات اور بڑے بڑے فورموں پر بڑی بڑی باتیں بگھارنے والے دانشور حضرات علم و تحقیق کے طالب علموں کو اپنے خزانوں سے ذرا بھی مہیا کرنے کو تیار نہیں ہوتے۔“ حقیقت بھی یہی ہے

نئی نسل میں ٹیلنٹ کی کمی نہیں صرف ان کا قبلہ درست کرنے کی ضرورت ہے شمیم فاطمہ کی خوبصورت نظم ”آؤ سمندر بن جائیں“ بے حد متاثر کن ہے۔ غزلیں بھی بے حد اچھی ہیں۔ ڈاکٹر شگفتہ نقوی کا ”ندامت“ بہترین سبق دے گیا ان عورتوں کے لئے جو چپ چاپ ظلم سہتی ہیں حالانکہ ظلم سہنا ہی ظالم کی مدد کرنا ہے ”سوتیلے پن کی چھاؤں“ اگر اس دفعہ کا بہترین افسانہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ عالیہ حمید صاحبہ! ماں تو ایثار و قربانی کا مجسمہ ہوتی ہے۔ لیکن آپ نے سوتیلی ماں کی عظمت کی کہانی دے کر واضح کیا کہ قربانی کی کوئی حد نہیں ہوتی اور اس کا صلہ بھی ضرور ملتا ہے جلد یا بدیر۔ سعدی مقصود کا ”آئیڈیل“ واقعتاً آئیڈیل ہی تھا۔ فرزانہ چیمہ صاحبہ کا ”چلتے چلتے“ بہترین موضوعات لئے ہوئے حسبِ معمول رنگینیاں بکھیرتے ہوئے جلوہ گر ہوا۔ لکھتی ہیں ”سچ ہے سائنس و ٹیکنالوجی کے دورِ عروج میں دلوں میں اتنا اندھیرا ہے کہ ہاتھ کو ہاتھ سچائی نہیں دیتا“ اضافے کے ساتھ اور یہی اندھیرا اور تاریکی وہ پاکستانیوں میں منتقل کرنا چاہتے ہیں جس میں وہ کامیاب بھی نظر آ رہے ہیں لیکن ہمیں احساس تک نہیں ہے کیا ہاشمی اور کیا گیلانی اندھیروں اور تاریکیوں پر راضی ہوئے بیٹھے ہیں۔ احساس ہی نہیں۔ دور اندیشی نام کو نہیں۔

وطن کی فکر کر ناداں مصیبت آنے والی ہے

تیری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں

اُمّ احمر۔ لاہور

کافی عرصے سے میں چمن بتول کی قاری ہوں، تاہم پہلی دفعہ اس کی محفل میں شرکت کر رہی ہوں اور اس کی وجہ ماہ اپریل میں چھپنے والا ڈاکٹر شگفتہ نقوی کا مضمون ”آپ کی ساس آپ کی محسن“ بنا ہے۔ اگرچہ مضمون کا آغاز واختتام لڑکیوں کے لئے مفید مشوروں اور رہنمائی کا حامل ہے جو کہ ہمارے دین کے تقاضوں سے بھی ہم آہنگ ہیں۔ تاہم عنوان اور مضمون کے درمیان کا حصہ ہندو معاشرت اور مذہبی تصورات کی ترجمانی کرتا نظر آتا ہے، جہاں لڑکے اور اس کے والدین کو مالکانہ حقوق حاصل ہوتے ہیں اور لڑکی اور اس کا خاندان غلاموں کی سی حیثیت اختیار کر جاتے ہیں۔ اسی سوچ نے ہندو معاشرے اور اس کی دیکھا دیکھی ہمارے معاشرے میں جہیز کی لعنت کو رواج دیا ہے۔ لڑکے والے اپنے بیٹے کی بولی لگاتے ہیں، جہیز وصول کرتے ہیں اور پھر بھی یہ سمجھتے ہیں کہ ہم نے لڑکی کی سات پشتوں پر احسان کیا ہے۔ قرآن اور حدیث سے تو ایسی کوئی بات ثابت نہیں ہوتی جس کی بنا پر یہ رائے قائم کی جائے کہ ”آپ کی ساس آپ کی محسن ہے۔“

ڈاکٹر صاحبہ نے ساس کے متعلق لکھا ہے کہ ”اس معزز خاتون نے بڑی مشکلوں سے تکلیف اٹھا کر اس بیٹے کو جنم دیا، اس کی پرورش میں اپنی نیند، خوراک، طاقت صرف کر دی۔ اس کی تعلیم و تربیت میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔“ ان کے جملوں سے لگتا ہے کہ گویا لڑکی کی ماں نے اسے بغیر تکلیف کے پیدا کیا اور اس کی پرورش میں نہ تو کوئی قربانی دی اور نہ ہی اس کی تعلیم و

تربیت کا کوئی اہتمام کیا۔ قرآن میں ماں کے مرتبے کے بارے میں بیان کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ اس نے تمہیں ضعف پر ضعف اٹھا کر پیدا کیا۔ یہ تو نہیں کہا گیا کہ بیٹوں کی ماؤں نے انہیں ضعف اٹھا کر پیدا کیا اور نہ یہ کہ تمہارے شوہروں کی ماؤں نے انہیں ضعف اٹھا کر پیدا کیا۔ یہ بات تمام انسانوں کے لئے ہے خواہ وہ لڑکا ہو یا لڑکی۔ گویا ہر ماں کا احسان اپنی اولاد پر ہے کسی دوسرے کی اولاد پر نہیں۔ پھر ڈاکٹر صاحبہ لکھتی ہیں کہ ساس بہو کو پسند کر کے دلار سے بیاہ کر لائی۔ یہ اس کا جرم ہے یا احسان۔ عرض ہے کہ احسان کس بات کا؟ کیا وہ اپنے بیٹے سے صورت شکل، مال و دولت یا سماجی مرتبے میں کم تر بھولائی ہیں؟ جی نہیں۔ انہوں نے اپنی ترجیحات کے لحاظ سے بہترین انتخاب کیا ہے۔ ہمارے ارد گرد ماؤں کے پسند کردہ کتنے جوڑے ایسے ہیں جنہیں دیکھ کر ہم یہ سوچیں کہ ساس صاحبہ نے ترس کھا کر اپنے بیٹے سے بیاہ لیا۔ یہ رشتہ ہی ایسا ہے کہ نہ لڑکی والے اور نہ لڑکے والے احسان کر کے جوڑتے ہیں بلکہ ہر کوئی اپنے طور پر بہترین پسند کرتا ہے۔ ہاں! لڑکی والوں کے لئے پسند کا اختیار محدود ہو سکتا ہے کہ انہیں آئے ہوئے رشتوں میں سے ہی پسند کرنا ہوتا ہے، لیکن لڑکے والوں کے لئے تو یہ میدان وسیع ہوتا ہے، چنانچہ وہ خوب سے خوب تر کی تلاش ہی کرتے ہیں۔ آگے چل کر تحریر ہے کہ ”ساس نے اس ننھے سے پودے کو اپنے خون سے سینچا، اپنا دودھ پلایا، بیماری میں خبر گیری کی، سکول کے لئے تیار کیا، دین سکھایا، آداب اور رشتوں کی پہچان سکھائی، جب یہ تن آور درخت بنا تو آپ کے حوالے کر دیا۔“ تو کیا لڑکی کی ماں نے یہ

سب نہیں کیا؟ کیا اس نے اپنی بیٹی کو داماد کے حوالے نہیں کیا؟ لڑکے کی ماں تو پھر بھی اس سے فیض اٹھاتی رہتی ہے، لڑکی کی ماں کے ہاتھ کیا آتا ہے؟ چنانچہ جب لڑکا اور لڑکی، دونوں کے والدین ایک ہی عمل سے گزر کر اولاد کا نیارشتہ جوڑتے ہیں تو برابری کے اس سودے میں احسان کس کا؟ یاد رکھیں کہ یہ معاملات لطف کرم اور احسان کے باعث نہیں بلکہ قوانین فطرت کے تحت انجام پاتے ہیں، چنانچہ انہیں نبھانے کے لئے بھی غیر حقیقی و غیر فطری اصول و جذبات سے پرہیز کرنا چاہیے۔

اس حصے سے قطع نظر مضمون کا بقیہ حصہ یقیناً اچھے مشوروں پر مشتمل ہے اور انسان کی فطرت کے مطابق بھی ہے کہ وہ اپنے فائدے، یعنی نیکی کے حصول کے لئے اور اللہ کی خوشنودی کے لئے ایسا کرنے پر آمادہ ہو سکتا ہے۔ امید ہے ڈاکٹر شگفتہ نقوی مضمون کے اُس حصے پر نظر ثانی کریں گی اور اسے فطری اور شرعی تقاضوں کے مطابق بنائیں گی۔

مریم شہزاد - کراچی

پچھلے آٹھ دس مہینوں سے ”ماہنامہ بتول“ پڑھنا شروع کیا شروع شروع میں تو نہایت بے دلی سے پڑھا بلکہ ایک آدھ بار تو بغیر پڑھے آگے بڑھا دیا مگر اب آہستہ آہستہ پچھلے چار پانچ ماہ میں باقاعدگی سے پڑھنا شروع کر دیا ہے اور اس کی تحریروں اور سبق آموز کہانیوں کے اسرار کھلتے جا رہے ہیں۔ بہت خوبصورت تحریریں ہیں، ”میری لائبریری“ کبھی نہیں پڑھا تھا مگر اپریل میں ”قرآن پر عمل“ نامی کتاب کے بارے میں پڑھا تو دل چاہا کہ فوراً کتاب

لا کر پڑھی جائے۔ بلاشبہ بتول بہت اچھا رسالہ ہے۔ میری ایک تحریر شائع ہو چکی ہے حوصلہ افزائی کا شکریہ مگر دوسری شاید ردی کی ٹوکری کی نظر ہو گئی۔ اس سے پہلے میں ”سوداگر“، ”ڈویک میگزین جنگ“، میں لکھ چکی ہوں مگر پانچ چھ سال بعد بتول سے دوبارہ شروعات کی ہے

ہما جبین فیصل - جدہ

اپریل کا شمار بہترین تحریروں سے مرقع تھا، صائمہ نے ادارہ میں حالاتِ حاضرہ کی بھرپور آگہی دی۔ سب پڑھ کر دل کافی دیر تک اداس رہا، اللہ تعالیٰ امت مسلمہ پر رحم فرمائے اور حالات سدھار دے بس یہی دعا ہے۔ اس دفعہ غزلیں تقریباً سبھی اچھی تھیں مگر ڈاکٹر نجمہ شاہین کی غزل بہترین لگی کافی دفعہ پڑھی، نسیم آرا کی نعت رسولؐ میں الفاظ کا چاؤ بہترین ہے۔

محمود غزنوی کی ترجمہ شدہ تحریر ”من الظلمت الى النور“ عمدہ انتخاب تھی۔ محمود صاحب کہیں جامعہ کراچی کے استاد تو نہیں ہیں؟ ہمارے زمانے میں شعبہ ابلاغ عامہ کے استاد تھے اور بہت اچھا بولتے اور لکھتے تھے (جی نہیں!)

عالیہ حمید کے افسانے کا پہلا حصہ اچھا لگا ہے امید ہے بقیہ بھی ایسا ہی ہوگا۔ سعدیہ شفیق کی مختصر تحریر ”اللہ کی میزبانی“ پڑھ کر آنکھیں نم ہو گئیں۔ ڈاکٹر مبین ذکا کے حالاتِ زندگی پڑھ کر بہت اچھا لگ رہا ہے یہ اچھا سلسلہ ہے ”کبھی ہم خوبصورت تھے“ ہمارے دل کی آواز تھا کچھ ایسے ہی جذبات و خیالات ہمارے بھی ہیں آج کل۔ نور اعجاز کا سفر نامہ اچھا رہا پڑھ کر اپنا

سری لیکا کا سفر یاد آگیا۔ ڈاکٹر شگفتہ نقوی سادہ انداز میں محبت بھرے اور دلوں کو جوڑنے والے مشورے دیتی نظر آئیں، بہت خوب!

شگفتہ فاطمہ کی تحریر ”بال سفید ہونا اور جھڑنا“ بہت غور سے پڑھا۔ ابھی کچھ وقت ہے بال سفید ہونے میں، تو تحریر سنبھال کر رکھ لی کہ وقت پڑنے پر دوبارہ پڑھ لیں گے۔ اس دفعہ کے ادارے میں ”خوشخبری“ نے دل خوش کر دیا کہ بتول اب ویب سائٹ پر بھی دیکھا جاسکتا ہے۔

ارم آصف صدیقی۔ جدہ

☆ ارم سے معذرت کہ ان کا خط خاصی دیر کے بعد شامل اشاعت ہو رہا ہے (مدیرہ)

اب سے دو تین ماہ پہلے بھی اسی طرح سے خط کا آغاز کیا تھا مگر ایک صفحہ بھی مکمل کرنے کی نوبت نہ آئی۔ شوہر محترم نے یونہی صفحہ اٹھا کر دیکھا تو پوچھنے لگے کہ یہ صائمہ باجی کون ہیں؟ اب کوئی بتلائے کہ ہم بتلائیں کیا!

بہر حال اس مرتبہ (اکتوبر) کے چمن بتول پر تبصرہ حاضر ہے۔ انوار ربانی میں ”مصیبتوں پر صبر“ (فضیلت رسول) اور قولِ نبیؐ میں ”اللہ کی راہ میں خرچ اچھی کوششیں ہیں۔ حاض مضمون ابھی پڑھا نہیں، امید ہے کہ معلومات افزا ہو گیا۔“ مسلمان عورت کے خلاف صلیبی جنگ“ پڑھ کر بے اختیار کلمہ شکر زبان سے ادا ہوا کہ اُس رب العالمین نے ہمیں ایک ایسی جگہ پر رکھا ہوا ہے جہاں اسلام کی تعلیمات پر عمل کرنا ہرگز دشوار نہیں ہے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ احساس بھی ہوا کہ مسلمان کی اس جنت میں رہتے ہوئے باعمل رہنا کمال

نہیں ہے۔ اصل جہاد تو وہ مسلم عورتیں کر رہی ہیں جنہیں دن رات صلیبی درندوں کا سامنا ہے اور وہاں بھی وہ اپنی اسلامی شناخت پر اصرار کرتی ہیں۔

حقیقت و افسانہ میں قانتہ رابعہ صاحبہ اس مرتبہ بھی بازی لے گئیں۔ واقعی آج کے فتنوں بھرے دور میں ایک ”ٹینشن فری“ زندگی گزارنا بڑا ہی مشکل کام ہے۔ اسی طرح ڈاکٹر کوثر فردوس صاحبہ نے اس اہم حقیقت کی طرف توجہ دلائی ہے کہ آج کا بے صبر انسان اللہ پر توکل کرنے کی بجائے جگہ جگہ خوار ہونا پسند کرتا ہے اور ملتا اُسے پھر بھی وہی کچھ ہے جو کہ اُس کے مقدر میں لکھا ہوتا ہے، بہت حد تک قصور ہمارے نام نہاد مسیحاؤں کا بھی ہے جنہوں نے مریض کو صرف اور صرف پیسے کمانے کا ذریعہ سمجھ لیا ہے۔

ہلکا پھلکا اس مرتبہ کچھ خاص نہ رہا البتہ سارا جہاں ہمارا میں ”حظلمہ“ دل کو چھو لینے والی تحریر تھی اسی طرح امریکہ سے ماریہ عمر نے بھی ”یہ کیسا رشتہ“ کے حوالے سے ہمارے دلوں پر دستک دی۔ واقعی یہ رشتہ ہی تو ہے جس نے عرب و عجم اور مشرق و مغرب کے مسلمانوں کو آپس میں بھائی بھائی بنا دیا ہے کاش کہ ہم سب مسلمان اس رشتے کا ادراک کر لیں اور اس کی اہمیت کو سمجھ لیں۔

☆ ہما منیر (سیالکوٹ) آپ نے انوار ربانی کے لئے جو مضمون بھیجا ہے وہ ہمارے کالم کے تقاضوں کے مطابق نہیں۔ ☆ ایک تحریر ”دنیا کے بتکدوں میں پہلا وہ گھر خدا کا“ موصول ہوئی ہے جس پر کوئی نام نہیں ہے۔ برائے مہربانی لکھاری رابطہ کریں۔

پیاری قاضی

بہت سی دعائیں

تمہاری دادی اماں کے انتقال کی خبر معلوم ہوئی بہت افسوس
ہوا۔ اللہ ان کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے یہ بھی معلوم ہوا کہ تم نے
ان کی بہت خدمت کی اللہ نے تمہیں سعادت مندی عنایت کی اس کا کرم
ہے۔ خوش نصیب ہیں وہ بزرگ جن کو عزت کرنے والے اور خدمت
کرنے والے بچے ملیں اور خوش نصیب ہیں وہ بچے جن کو شفیق بزرگ
ملیں۔

تم سب کے لئے ان کی کمی ظاہر ہے معمولی بات نہیں۔ مگر اللہ
نے دستور ایسا بنایا ہے جس کے آگے سر تسلیم خم کرنا ہی پڑتا ہے۔

اپنی دادی اور اباجی سے میری طرف سے تعزیت کرنا اللہ تعالیٰ
تم سب کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ سب کی خدمت بھی میرا سلام کہنا
تم سب کے غم میں شریک

تمہاری مینا پھپھو

چلتے چلتے

کی سادگی ہے کہ سارا دھن کمرے میں رکھ چھوڑا۔ انھیں دھن کی بیماری نہیں لگی ورنہ اس دولت سے کیا کیا نہ بنا لیتے کہیں سرے محل..... کہیں جاتی عمرہ..... کہیں چک شہزاد..... دوسری طرف ہم لوگ ہیں کہ دونوں ہاتھوں سے ملک لوٹنے والوں..... جعلی ڈگریوں والوں..... ہر ادارہ مین کرپشن کرنے والوں کو بدستور اپنے اپنے عہدوں پر بحال رکھے ہوئے ہیں جبکہ عوام ان کے ”سنہری کارناموں“ کے ہاتھوں بے حال ہوئے پھرتے ہیں۔ نہ گیس، نہ بجلی، نہ آٹا، نہ دال، نہ پٹرول! ایسا کیوں ہے آخر؟ بس کچھ نہ پوچھیں..... دہشتی پنکھے سے اپنا پسینہ پونچھیں اور دعائیں دیں ان حاکموں کو جو خود تو ہر طرح کی آسائش و زیبائش میں ہیں بقول اکبر الہ آبادی ۛ

رنج شاہ کو بھی بہت ہے مگر آرام کے ساتھ
قوم کے غم میں ڈنر کھاتا ہے حکام کے ساتھ
اور ڈنر فرمانے کے بعد قوم کو نید دیتا ہے کہ مسائل حل ہو گئے۔ مہنگائی اتنے فیصد کم ہو گئی وغیرہ وغیرہ۔ ان کا تو یہ حال ہے۔

روٹی ہے نہ لنگوٹی ہے پھر بھی تو مالا مال ہے
شکر کر ہیں کان، آنکھیں اور بدن پر کھال ہے

☆☆☆

پیارے ’بتول‘ کے ان صفحات پر آج کی چند خبریں اور ان پر ہمارا تبصرہ ملاحظہ فرمائیے۔ شاید اس جہس میں کوئی تازہ ہوا کا جھونکا آپ محسوس کریں ورنہ تو ایک عرصے سے وطن عزیز کے ایسے حالات ہیں کہ ۛ

اب بوئے گل نہ باد صبا مانگے ہیں لوگ
وہ جس ہے کہ لو کی دعا مانگتے ہیں لوگ

”بھائی سادھو کی موت کے بعد کمرے سے منوں سونا برآمد۔ لوگوں کو دنیا سے دور رہنے کا درس دینے والا ہندو بابا خود اس قدر دنیا دار انسان تھا کہ اس نے اپنے خاص کمرے میں ۸۰ لاکھ امریکی ڈالر کا سامان چھپا رکھا تھا۔ کمرے سے ملنے والا سونا ۴۵۰ کلو گرام ہے۔ یہ دولت ان کے امیر کبیر چیلوں نے دان کی تھی۔ بابا کے چیلوں میں سچن ٹنڈلکر، من موہن سنگھ، سونیا گاندھی، امیتا بھ بچن جیسی شخصیات شامل ہیں۔ اس سے متنفذ ہونے والوں کی تعداد بڑھ رہی ہے۔“

یہ متنفذ ہونے کی بھی خوب رہی۔ ارے بھئی! ان سادھو صاحب نے نہ تو کہیں ڈاکہ ڈالا نہ ٹیکس چوری کی، نہ غبن کیا نہ بنک سے قرضے معاف کروائے، نہ کسی کے وزیر نہ مشیر رہے کہ دولت میں کھیلتے۔ یہ تو سب عقیدت کا کھیل ہے۔ اور جب عقیدت مند بھی ایسے ایسے چوٹی کے لوگ ہوں تو پھر دان بھی اپنے حساب سے کرتے ہوں گے۔ سادھو صاحب

”یکم جنوری تا مارچ ۲۰۱۱ء کی پنجاب پولیس کی رپورٹ: ۹۹۲۰۲ مقدمات درج..... ہر ۲۵ منٹ بعد اغوا..... ہر دو گھنٹے بعد ڈاکہ، ۸۰ منٹ بعد گاڑی چھینی گئی۔ ہر چالیس منٹ بعد موٹر سائیکل، ہر ۵۵ منٹ بعد مویشی چوری: پنجاب پولیس کی ویب سائٹ۔“

یہ تو پنجاب کا حال ہے جہاں کا وزیر اعلیٰ شلوار قمیص پہنے کبھی دانش سکولوں کا جال بچھا رہا ہے تو کہیں آشیانہ بنانے کی فکر میں ہے۔ جس کا بڑا بھائی ایک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے..... کبھی زرداری کو بڑا بھائی بنا لیا کبھی اس کی سیاست کو نوڈیرو میں دفن کرنے کی دھمکی لگا دی۔ یہ کیسا بھائی چارہ ہے..... یہ کیسا سیاسی چارہ ہے۔ کراچی میں اور دوسرے صوبوں کے حالات اس سے بھی اتر ہیں۔ مگر اسلام آباد میں سب چین کی بانسری بج رہے ہیں۔ ایک شہری جبار واصف کے تاثرات ملاحظہ فرمائیے کیسے غضب کے ہیں:

قتل ہوتا دیکھ کر میں جا بجا انسان کو ایک چٹھی لکھ رہا ہوں صدر پاکستان کو چار سو اس ملک میں تاریکیوں کا راج ہے کل تو بدتر تھا مگر، کل سے بھی بدتر آج ہے کس قدر اس ملک میں قانون ہے بکھرا ہوا جس طرف بھی دیکھیے بس خون ہے بکھرا ہوا یہ ستم کچھ اس لیے تم کو نظر آتا نہیں کیوں نہ اس کی زد کے اندر تیرا گھر آتا نہیں

☆☆☆

”پاکستان امن مشن میں خواتین کی تعداد بڑھائے۔“

لابریا میں پاکستان کے امن دستے میں ۳ ہزار افواج ہے ان میں صرف سات خواتین ہیں: اقوام متحدہ“

امن مشن میں خواتین کی تعداد بڑھائیں؟ چہ خوب۔ ہم نے امن مشن میں گزشتہ کئی برسوں سے خواتین چھوڑنے، بوڑھے، جوان..... فصل، مکان ہر شے لگا دی ہے ابھی بھی دشمن کا راج نہیں ہوتا اور ہور ہور کا نعرہ لگاتا جاتا ہے۔ جسے وہ اپنی زبان میں ڈومور کہتا ہے۔ گزشتہ کسی مہینے ہم نے انہی صفحات میں برطانوی فوج میں خواتین کی حالت زار کی ایک خبر لگائی تھی..... ان خواتین کا یہ حال ہے تو پھر مسلمان عورتوں کا فوج کے امن دستے کے ساتھ رہنے پہ کیا حال ہوتا ہوگا۔ یہ تو وہ سات خواتین ہی واپس آ کر بتائیں گی (اگر واپس آ گئیں تو)

نہ جانے یہ خواتین کس شوق میں لابریا سدھار گئیں.....؟ مساوات مردوزن بھی ایک مہلک بیماری ہے جسے لگ جائے اس کا ایمان لیے بغیر جان نہیں چھوڑتی۔ امت رسول ہاشمی صلی اللہ علیہ وسلم میں شامل یہ خواتین قرآن و سنت جیسی نعمتیں پانے کے باوجود اپنے عورت ہونے پر شرمندہ شرمندہ سی کیوں رہتی ہیں۔ خود کو مردوں سے کم تر کیوں محسوس کرتی ہیں۔ عورت تو حیا اور وفا کا وہ نازک آئینہ ہے کہ جس کے پاؤں میں جنت اتار دی گئی ہے۔ وہ اپنی اتنی عظمت، اتنی بلندی پہ فخر کیوں نہیں کرتی؟

میں جمال فطرت حسن ہوں، میری ہر اداسے حسین تر جو جھکوں تو شاخ گلاب ہوں، جو اٹھوں تو ابر بہار ہوں

☆☆☆

”امریکہ: ۹۷ سالہ شخص نے بیوی کو ہیرے کی انگوٹھی دینے کا وعدہ ۶۵ سال بعد پورا کر دیا۔ شادی سے قبل ہیرے کی انگوٹھی پہنانے کا وعدہ مالی حالات کی وجہ سے پورا نہ ہو سکا۔ اب پیسے بچا کر یہ وعدہ پورا کیا ہے۔“

یہ خبر پڑھ کر شاید کچھ خواتین کی آنکھوں میں چمک آجائے اور دل میں رشک کہ خاوند ہو تو ایسا اور وعدہ نبھائے تو اس طرح۔ اور وعدہ کرے تو ایسا زبردست یعنی ہیرے کی انگوٹھی سے کم کا نہ کرے۔

قارئین محترم! ٹھہریے! رشک کرنے میں جلدی نہ کیجیے کہ سونے چاندی کا حصول قابل رشک نہیں ہوتا۔ ایک حدیث کی رو سے رشک صرف دو لوگوں پر جائز ہے۔ کون سے لوگ؟ آپ جانتے ہی ہوں گے اگر نہیں جانتے تو کسی جاننے والے سے پوچھ لیجیے گا۔ ویسے بھی سب سے بڑا ہیرا تو اچھا ساتھی ہے۔ یہ مل جائے تو پتھروں کی کیا ضرورت رہ جاتی ہے۔ پھر بھی عام عورت کا دل زیور، کپڑے میں اٹکا رہتا ہے۔ لہذا یہ خبر عام خواتین نے جب پڑھی ہوگی تو شام کو اپنے اپنے شوہروں کی شامت تو لے آئی ہوں گی..... ذرا آپ بھی چشم تصور سے نظارہ تو کریں۔

”یہ خبر تو ذرا پڑھیے! دیکھیے کیسا اچھا شوہر ہے کوئی ۶۵ سال بعد بھی اس نے اپنا وعدہ نباہی دیا۔ ایک آپ ہیں کہ کب سے کہہ رہے ہیں کہ سونے کی دو چوڑیاں بنوادوں گا مگر مجال ہے جو وعدہ نبھانے کا سوچا ہو کبھی۔“

”بھلی مانس! اس کی بیوی نے تو کبھی اس طرح تقاضا نہیں کیا ہوگا جیسے تم میرے سر پر چڑھ رہی ہو۔ یہاں سونے

کو تو پلنگ نہیں تم سونے کی چوڑیاں نہیں بھولتیں۔ میں بھی انہی حالات کا شکار ہوں جس کا وہ تھا تب ہی تو ۶۵ سال لگائے اس نے۔ تم سے تو ۶۵ ماہ بھی انتظار نہیں ہو پا رہا۔“ چلے رہے دیکھیے۔ باتیں بنانا تو کوئی آپ سے سیکھے۔ اس نے دیا بھی تو ہیرا ہے ہیرا۔

ہیرا تو میں بھی دے ہی دیتا اوکھے سوکھے ہو کر اگر میرے سامنے کوئی ہیرا ہوتی..... تو بھی تو ہیرا نہیں۔ نہ رنگ روپ..... اپنا حلیہ، اپنی جسامت دیکھی ہے کبھی.....؟ ایک میرا ہے اداکارہ۔ کیسی نازک اندام، کیسی سبک رفتار ہے۔ ایک تم ہو کہ۔

چالیس انچ کا گھیر ہے اس کا تیری کمر ہے یا کوئی کمر ہے اچھا۔ اچھا اب اس اداکارہ منحوس ماری سے تو میرا مقابلہ نہ کریں۔ رہنے دیں میری چوڑیاں اور اپنے وعدے۔ مجھے نہیں چاہیے کوئی بھی زیور۔ بس آپ سیدھے رہیے..... سیدھے دفتر جائیے سیدھے گھر آئیے۔ خدارا ان میراثوں، ڈومنیوں پر نگاہ مت ڈالیے..... میری توبہ جو کبھی آپ کو وعدہ یاد دلایا تو۔

میں نہ لوں تجھ سے ہیرا تو بھی نہ کر میرا، میرا



کچن کارنر

4 جوئے، ثابت دھنیا ایک چائے کا چمچ، نمک حسب ذائقہ،

ثابت لال مرچ آٹھ عدد، ہر ادھنیا کٹا ہوا آدھی پیالی۔

ترکیب: چنے کی دال کو رات بھر بھگو دیں۔ اب ایک دیکھی میں کدو، آلو، ٹماٹر، دال، زیرہ، نمک، ثابت لال مرچ، گرم مصالحہ، ثابت دھنیا اور لہسن ڈال کر چھ پیالی پانی ڈال کر پکنے کیلئے رکھ دیں۔ جب پانی خشک ہو جائے اور تمام چیزیں گل جائیں تو انہیں پیس لیں۔ آمیزہ بہت زیادہ پتلانہ ہو۔ اگر ایسا ہو جائے تو تھوڑا بنسن شامل کر دیں۔ اس کے بعد اس میں چوپ کی ہوئی پیاز، ہر ادھنیا اور باریک کٹی ہوئی ہری مرچ ڈال کر کباب بنالیں۔ انڈا لگا کر فرائی کریں اور کچپ کے ساتھ پیش کریں۔

دہی چکن

اشیا: چکن ایک کلو، دہی ایک کپ، پیاز 2 عدد (چوپ کر لیں)، ادک لہسن پیسٹ 1 کھانے کا چمچ، کٹی ہوئی لال مرچ 1 چائے کا چمچ، سفید زیرہ 1 چائے کا چمچ، پسلی لال مرچ 1 چائے کا چمچ، ٹماٹر پیسٹ 3 کھانے کے چمچ، نمک حسب ذائقہ، ہری مرچ 4 عدد، پسپا ہوا گرم مصالحہ 1 چائے کا چمچ، قصوری میتھی 1 چائے کا چمچ، لیموں کا رس 1 کھانے کا چمچ، لیموں 4 عدد، ٹماٹر 2 عدد۔

ترکیب: چکن پر دہی لگا کر آدھ گھنٹے کے لئے رکھ

آلو کریلے کی بھجیا

اشیا: آلو ایک پاؤ کیو بڑ کاٹ لیں، پیاز ایک پاؤ، سبز دھنیا ایک پیالی، ٹماٹر ایک پاؤ، سبز مرچ 5 عدد، سفید زیرہ دو چائے کے چمچ، نمک حسب ذائقہ، خشک دھنیا ایک چائے کا چمچ، ہلدی آدھا چائے کا چمچ، تیل حسب ضرورت کریلے، ½ کلو

ترکیب: کریلے چھیل کر باریک کاٹ کر کڑواہٹ ختم کرنے کے لئے نمک لگا کر دو گھنٹے کے لئے رکھ دیں۔ پھر ان کو اچھی طرح نچوڑ کر دھولیں۔ کریلوں کو تیل گرم کر کے ہلکا سا فرائی کر کے نکال لیں۔ آلو چوکور کاٹ کر تیل میں ڈال دیں ہلکا سا نمک اور سفید زیرہ ڈال کر آلوؤں کو ہلکی آنچ پر گلا لیں اور ہلکے براؤن کر کے نکال لیں۔ اب تیل میں باریک کٹی ہوئی پیاز ڈال کر ہلکا براؤن کریں۔ پھر اس میں ٹماٹر اور سارے مصالحے ڈال دیں اور اچھی طرح بھونیں۔ پھر کریلے اور آلو ڈال کر دم دیں اوپر سے ہری مرچیں اور ہر ادھنیا ڈال کر پیش کریں۔

وٹیکٹیل کباب

اشیا: کدو آدھا کلو، آلو 2 عدد، ٹماٹر 1 عدد، پیاز 2 عدد، چنے کی دال ایک پاؤ، ثابت گرم مصالحہ ایک کھانے کا چمچ، ہری مرچ تین سے چار عدد، زیرہ ایک چائے کا چمچ، لہسن

ترکیب: تمام اجزاء کو بلینڈر میں ڈال کر بلینڈ کر لیں۔
ایک پیالی برف شامل کر کے دوبارہ بلینڈ کریں خوبصورت
لمبے گلاسوں میں ڈال کر پیش کریں۔



دیں۔ گھی میں چو پڈ پیاز سرخ کریں اور چکن اور ادراک لہسن
پیسٹ ڈال کر بھونیں کٹی ہوئی لال مرچ، سفید زیرہ، لال
مرچ ڈال اور ٹماٹو پیسٹ شامل کر دیں۔ پھر نمک ڈال کر ہلکا
سا پانی کا چھٹا دے کر پکائیں۔ پھر اس میں قصوری میتھی، گرم
مصالحہ اور لیموں کا رس ڈال کر بھونیں۔ ہری مرچیں موٹی
کاٹ لیں اور لیموں کے 4، 4 حصے کر لیں۔ ٹماٹر چوپ کر لیں
یہ تمام چیزیں چکن میں ڈال کر 3-4 منٹ پکائیں اور اتار لیں
۔ ہر ادھنیا اور ہری مرچ ڈال کر پیش کریں۔

فروٹ کریم

اشیا: تازہ کریم 250 گرام، چینی ایک چوتھائی کپ،
انار کے دانے ایک چوتھائی کپ، سیب ایک عدد (چھوٹے
ٹکڑے کاٹ لیں)، کیلا ایک عدد، بادام (بھگو کر چھلے ہوئے
چند دانے)، کشمش ایک کھانے کا چمچ (دھو کر صاف کر لیں)،
چھوٹی الائچی ایک عدد (دانے پیس لیں)، انگور 12 دانے،
جیری تین عدد (چھوٹے ٹکڑے کاٹ لیں)۔

ترکیب: چینی اور کریم کو اچھی طرح پھینٹ لیں۔ اس
میں پھیننے کے دوران تھوڑا سا دودھ اور دو تین چمکی نمک اور
معمولی سی کالی مرچ بھی ملا دیں۔ اب تمام کٹے ہوئے پھل
ملا کر ذرا مکس کریں پھر بادام اور کشمش ڈال کر پیسی ہوئی
الائچی چھڑک دیں۔ لیجئے فروٹ کریم تیار۔

اسٹرابری پنچ

اجزاء: اسٹرابریز 10 عدد، اسٹرابری سیرپ 2 چمچ، چینی
ڈیڑھ کھانے کا چمچ، اسٹرابری آئس کریم 2 سکوپ، دودھ
ایک کپ۔